شیخ نورالدین ولی

غلام نبی گوہر

شیخ نورُالدین ولی

غلام نبی گوہر

حضرت شیخ نور الدین ولیؒ

سرورق کے آخری صفحہ پر سنگ تراشی کے جس نمونے کی تصویر دی گئی ہے، اس میں تین جیوتشی بھگوان بدھ کی ماتا مہارانی مایا کے خواب کی تعبیر بیان کررہے ہیں، اور ان کے نیچے ایک کاتب بیٹھا ان کی تعبیر قلمبند کر رہا ہے۔ یہ شاید ہندستان میں لکھنے کے فن کی قدیم ترین تصویری مثال ہے۔

(ناگ ارجن کونڈ، دوسری صدی عیسوی)
(بشکریہ نیشنل میوزیم، نئی دہلی)

ہندوستانی ادب کے معمار

حضرت شیخ نورالدّین ولیؒ

(نند ریشی)

مصنّف

جی، این، گوہر

مترجم

ڈاکٹر مجید مضمر

ساہتیہ اکادمی

Sheikh Noor-ud-Din Wali : Urdu translation by Majeed Muzmar of Ghulam Nabi Gauhar's monograph in English. Sahitya Akademi, New Delhi (1996), Rs.15.

پہلا ایڈیشن ۱۹۹۶ء

ساہتیہ اکادمی

ہیڈ آفس

رویندر بھون۔ ۳۵ فیروز شاہ روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

سیلز آفس

سواتی، مندر مارگ۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

علاقائی دفاتر

جیون تارا بھون۔ چوتھی منزل، ۲۳اے / ۴۴ ایکس، ڈائمنڈ ہاربر روڈ، کلکتہ ۷۰۰۰۵۳

۱۷۲، ممبئی مراٹھی گرنتھ سنگھرالے، دادر ممبئی ۴۰۰۰۱۴

گنا بلڈنگ، دوسری منزل۔ ۳۰۴۔ ۳۰۵، انا سلائی، تینام پیٹھ۔ مدراس ۶۰۰۰۱۸

اے۔ ڈی۔ اے رنگ مندر ۱۰۹ جے۔ سی۔ روڈ۔ بنگلور ۵۶۰۰۰۲

قیمت : پندرہ روپے

ISBN 81-260-0117-8

طباعت : سپر پرنٹرز، دہلی۔ ۱۱۰۰۵۱

مشمولات

پیش لفظ

علمدارِ کشمیر حضرت شیخ نورالدّین ولیؒ جو نندرِ ریشی کے نام سے مشہور ہیں، کشمیر کی ایک تابناک علامت اور یہاں کے عوام کے لیے مشعلِ راہ تصوّر کیے جاتے ہیں۔ ایک ولی، انقلابی محبِّ وطن اور شاعر کی حیثیت سے انھوں نے اس شاداب وادی کے لوگوں کے عقائد اور ان کی ذہنی سوچ پر زبردست اثرات مرتسم کیے ہیں۔ ان کے افکارِ عالیہ نے پانچ صدیوں سے زائد عرصہ سے کئی نسلوں کی فکری تشکیل و تہذیب کی ہے اور اللہ کی ہمہ جائی پر اپنے کامل ایمان کے ساتھ مکمّل مذہبی رواداری کے کلچر کی بنیاد ڈالی ہے۔

کشمیر نے عظیم شخصیتوں کی ایک کہکشاں کو جنم دیا ہے لیکن خال ہی کوئی شخصیت حضرت شیخ نورالدین ولیؒ کی طرح نامور اور ہمہ جہت ہے۔ ان کے زمانے ہی سے ان کی عظمت کا بڑے پیمانے پر اعتراف کیا جاتا رہا ہے۔

وِتستا کی بلند پایہ بیٹی للہ عارفہ نے حضرت شیخؒ کو اپنا روحانی وارث قرار دیا تھا۔ ۱۴۳۸ء میں جب نندرِ ریشیؒ اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے تو رحم دل بادشاہ، بڈشاہ (سلطان زین العابدین: ۱۴۲۰ء – ۱۴۷۰ء) ماتم گساروں کے بہت بڑے جلوس میں جنازے کو کاندھا دینے والوں میں شامل تھا۔ سولھویں صدی کے انتہائی قابلِ احترام ولی حضرت شیخ حمزہ مخدومؒ ان کی درگاہ پر خراجِ عقیدت ادا کرنے کے لیے اکثر چرار جایا کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ سری نگر میں اپنی قیام گاہ سے پینتیس میل کا یہ سفر وہ پیدل طے کرتے تھے جس میں سے آدھا راستہ وہ برہنہ پا چلتے تھے۔

بابر کے خالو زاد بھائی مرزا حیدر دوغلت (۱۴۹۹ء – ۱۵۵۱ء) نے کشمیر پر مختصر عرصہ

کے لیے حکومت کی لیکن وہ بھی محض اس عارف باللہ کی مقبولیت کا سہارا لینے کی بنا پر۔ یہی طریقۂ کار بعد میں شہنشاہ اکبر نے دُہرایا جس نے خراج کے طور پر چرار کے ریشی صدر مرکز کے نام بڑی عطیات وقف کیں۔ چنانچہ اس کی رو سے اُسے وہ سیاسی فائدے حاصل ہوئے جو بڑے اہم نتائج کے حامل تھے۔ افغان دَور کا ایک گورنر سُکھ جیون مل (۱۷۵۶ء - ۱۷۶۹ء) مختصر عرصہ کے لیے مرکزی اقتدار (کابل) سے علیحدہ ہوا اور (اس دوران) اس نے ریشی تحریک کی ایک مفصّل تاریخ اور اس تحریک کے قاید کی سوانح عمری لکھنے کے لیے فارسی کے ایک نامور عالم اور شاعر کو نامزد کیا۔ کابل کے ایک اور گورنر عطا محمد خان کو جس نے ۱۸۰۹ء میں کشمیر کی خود مختاری کا اعلان کیا، نے اپنی حکومت کو مقبول بنانے کی خاطر حضرت شیخ نورالدینؒ کے نام کے سونے اور چاندی کے سکّے جاری کیے۔

حضرت شیخ نورالدینؒ کی وفات کے فوراً بعد لوگوں نے ان کے مدفن کی تعمیر میں بڑی دلچسپی لی اور جہاں جہاں انھوں نے کچھ وقت گزارا تھا، وہاں وہاں مناسب یادگاریں کھڑی کیں۔ سلطان زین العابدین کی نگرانی میں لوگوں نے ایک آستان اور خانقاہ کی تعمیر کی۔ بعد میں سلطان علی شاہ چک (۱۵۷۰ء - ۱۵۷۸ء) نے آستان کے چاروں طرف منقش چوبی ستونوں کا ایک برآمدہ تعمیر کروایا۔ انیسویں صدی کے اوائل میں افغان حکمران عطا محمد خان نے خانقاہ اور مقبرے کی تعمیرِ نو کا بیڑا اُٹھایا لیکن وزیر فتح محمد خان کے ہاتھوں شکست کھانے کے نتیجے میں اسے مکمل نہ کروا سکا۔ ۱۹۵۱ء میں جموں و کشمیر کے نائب وزیر اعظم بخشی غلام محمدؒ نے اس نامکمل کام کو اپنے ہاتھوں میں لیا اور درگاہ کی مرمت کروائی۔ ۱۹۶۴ء میں (ریاستی) اوقاف ٹرسٹ کے صدر کی حیثیت سے شیخ عبداللہ نے اس (درگاہ) کی انتظامیہ کا کام سنبھالا[1]۔ دریہ گام، کیموہ

---

[1] ۱۱ اور ۱۲ مئی ۱۹۹۵ء کی درمیانی شب کو جب لوگ عیدالاضحیٰ کی تقریبات میں مصروف تھے ایک دلدوز سانحہ پیش آیا۔ چرار شریف کی یہ درگاہ ایک مکروہ سازش کے تحت نذرِ آتش ہوئی اور ساتھ ہی اس سے ملحق قدیم خانقاہ بھی۔ چرار کے قصبہ کا بڑا حصہ بھی اس آگ میں جل کر راکھ ہوا۔ درگاہ کی تعمیرِ نو کے لیے اس وقت کوششیں ہو رہی ہیں۔ - مترجم۔

اور چرم (ژرمر) جیسے مقامات پر لوگوں نے یادگاریں کھڑی کیں جن کی متعدد بار مرمت یا تعمیرِ نو کی جاتی رہی ہے۔

خود حضرت شیخ کے دورِ حیات میں شاہِ ہمدان حضرت امیر کبیر میر سیّد علی ہمدانی رح (۱۳۴۱ء - ۱۳۸۵ء)، حضرت میر محمد ہمدانی رح (۱۳۷۲ء - ۱۴۵۰ء) اور حضرت سید حسین سمنانی رح (متوفی ۱۴۲۱ء) جیسے نامور مبلغین نے ان کے ساتھ مراسم قائم کیے۔ ایسے کئی ممتاز مقامی ولی اور سادھو بھی تھے جو افتخار و انبساط کے ساتھ ان کے مریدوں کے حلقہ میں شامل ہوئے، یہاں تک کہ بعض غیر ملکی بھی ان کے پیرو بن گئے۔

اس خطّے کے ایک قطب کی حیثیت سے حضرت شیخ نور الدّین نے حقیقت مطلق کے متلاشیوں کو ہدایت کی مشعل دکھائی۔ ایک مقبول عوامی قاید کی حیثیت سے انھوں نے عدم تشدّد اور مذہبی رواداری کو ہماری قومی سوچ کے بنیادی اجزاء بنا دیا اور ایک باصلاحیت منتظم کی حیثیت سے انھوں نے کشمیر کے ہر حصّہ میں اپنی تنظیم کی تشکیل کی۔ انھوں نے ہماری تمدّنی روایات کو زوال پذیری کے نازک مرحلے میں ایک نئی سمت عطا کی۔ آپ ایک ایسے وقت میں کشمیری زبان کے بہی خواہ اور محافظ ثابت ہوئے جب اس کے وجود کو فارسی زبان کی طرف سے زبردست خطرہ لاحق تھا۔

ہر روز ہزاروں زائرین چرار شریف میں آپ کے آستان عالیہ اور وادی میں جگہ جگہ آپ کی یادگاروں پر خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔ آپ کی تعلیمات سے فیض پانے والے عوام آپ کے سالانہ عرس کو مقدّس دن کے طور پر مناتے ہیں۔ جمعرات کو ان کے مزار پر خصوصی اجتماع ہوتا ہے اور یوں "ژرار برسوار" (چرار شریف کی جمعرات) ہمارے لوک ادب کا ایک موضوع بنا ہے۔ سال ۱۹۷۲ء - ۱۹۷۳ء کے دوران کلچرل آرگنائزیشن[1] کی اپیل پر کشمیری عوام نے جوش و خروش اور بڑی عقیدت و احترام کے ساتھ "سال علمدار" منایا۔ ۱۹۷۷ء میں ریاستی حکومت نے ایک جامع ششش صد سالہ تقریبات کمیٹی[2] تشکیل دی جس نے اس عارف شاعر کی یاد میں مختلف تقریبات کا انعقاد کیا۔ ریڈیو

---

[1] کشمیری ادیبوں کی یہ نمائندہ ادبی انجمن ۱۹۷۲ء میں قائم ہوئی، مصنّف تین مرتبہ اس کا صدر منتخب ہوا۔

[2] ایس آر او نمبر ۱۲۲۴ جی ڈی مورخہ ۳ نومبر ۱۹۷۷ء کے تحت حکومت جموں و کشمیر نے یہ کمیٹی تشکیل دی۔ شیخ عبداللہ اس کے سرپرست اعلیٰ تھے اور مصنّف اس کا چیئرمین۔

کشمیر نے 'علمدارِ کشمیر' کے نام سے سال بھر ایک خصوصی ہفتہ وار پروگرام پیش کیا۔ ساہتیہ اکادمی نئی دہلی نے ۱۹۷۸ء میں (حضرت شیخ پر) ایک قومی سیمینار منعقد کیا۔

اس حقیقت کے باوجود کہ عوام کے ایک فیض رساں قاید کی حیثیت سے حضرت شیخ کی شخصیت بڑی تاریخ ساز رہی ہے، وہ روایتی قصّوں (Legends) کے ہی ہیرو نظر آتے ہیں۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ ایک تاریخی حقیقت اسطور کی پُراسرار گود میں سُلا دی گئی ہے یہاں تک کہ حقیقت کو فسانے سے الگ کرنا محققین کے لیے مشکل بن گیا ہے۔ اس لحاظ سے ضرورت اس بات کی ہے کہ حضرت شیخؒ کی ایک ایسی سوانح عمری مرتب کی جائے جو مستند اور معتبر ہو۔

بدقسمتی سے ان کی حیات کے بارے میں عصری مواد مخدوش حالات میں غائب ہوگیا ہے اور ان کی وفات کے بعد تحریر کردہ یا مرتب کردہ سوانح عمریاں اور تذکرے یا ریشی نامے ہمیں صرف مبہم واقعات اور اُلجھے ہوئے قصّے فراہم کرتے ہیں۔ حقائق ان تجاوزات و قصّہ جات کی دُھند میں کھو گئے ہیں جو معجزات اور فوق الفطری واقعات سے متّصل ہیں۔

زیرِ نظر کتاب میں حضرت شیخ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے متعلق واقعات یا اُن متعدد بیانات سے حاصل شدہ مواد کا جامع، مناسب اور مفصّل جائزہ پیش کرنا ممکن نہیں ہے جو مختلف سوانح عمریوں اور ریشی ناموں میں ملتے ہیں۔ تاہم ان کی شخصیت کی کچھ اور جہات کو نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو ان کی حاوی عارفانہ قد و قامت کے باعث اب تک نظروں سے اوجھل رہی ہیں۔

مآخذ

حضرت شیخ نورالدینؒ کی حیات اور شخصیت کے بارے میں اگرچہ بہت ساری کتابیں لکھی گئی ہیں تاہم ان کی کوئی مستند سوانح عمری دستیاب نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بدقسمتی سے اوّلین تحریریں ملتی نہیں ہیں اور بعد کے بیانات اس قدر مسخ شدہ ہیں کہ ان کی رو سے حضرت شیخ کم و بیش فوق البشر دکھائی دیتے ہیں۔

چودھویں اور پندرھویں صدی کے وقائع نویسوں نے صرف بادشاہوں کے کارنامے یا شاہی درباروں میں زندگی سے متعلق کچھ واقعات بیان کیے ہیں۔ اس عمل میں انھوں نے دوررس اہمیت کے ایسے واقعات حذف کیے ہیں جن کا شاہی معاملات سے ویسے کوئی تعلق نہیں تھا۔ تاہم سلطان زین العابدین کے ایک مورخ جونراج (۱۴۳۰ء۔ ۱۴۷۰ء) نے اپنی سنسکرت وقائع "زین راج ترنگی" میں اس بات کا نہایت واضح الفاظ میں ذکر کیا ہے کہ ملاّ نورالدّین کو سلطان علی شاہ (۱۴۱۳ء ۔ ۱۴۱۹ء) کے دورِ حکومت میں گرفتار کر کے قید کر لیا گیا تھا۔ اس سلسلے میں متضاد رائیں پیش کی گئی ہیں لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ واقعہ حضرت شیخ نورالدّین سے تعلق رکھتا ہے۔

سلطان زین العابدین کے دربار کا ایک وزیر ملاّ احمد کشمیری، فارسی، عربی اور سنسکرت کا بہت بڑا عالم تھا۔ اس کی "وقائع کشمیر" چودھویں اور پندرھویں صدی کے واقعات کے بارے میں ایک اہم دستاویز ہے لیکن بدقسمتی سے اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ بعد میں انیسویں صدی کا ایک مورخ پیر غلام حسن کھویہامی اس ماخذ سے استفادہ کرنے کا دعویٰ کرتا ہے لیکن اپنی تحویل سے اس وقائع کے پراسرار طور پر غائب ہو جانے کے بارے

ہیں اس نے جو واقعہ بیان کیا ہے وہ اس کے دعویٰ کو مشکوک نہیں تو بحث طلب ضرور بنا دیتا ہے۔

یوسف شاہ چک کے دَورِ اقتدار میں ۱۵۷۷ء میں سید علی نے فارسی زبان میں کشمیر کی تاریخ رقم کی۔ اس کا دعویٰ ہے کہ اس نے حضرت شیخؒ کے زمانے کے قریب کے دو ماخذ یعنی تاریخِ قاضی ابراہیم اور حاجی بابا ادہمی کی تصنیف "تذکرۂ اولیائے کشمیر" سے کافی حد تک استفادہ کیا ہے۔ یہ دونوں کتابیں اب دستیاب نہیں ہیں اور نہ ہی سید علی نے ان کا بہت زیادہ مواد استعمال کیا ہے۔ ان ماخذ میں شامل مواد کی روشنی میں اس نے صرف حضرت شیخؒ کے رتبے اور ان کے قدو قامت کو بیان کرنے کی طرف توجہ دی ہے۔

"گوہر عالم" کا مصنّف بدیع الدین عبدالقاسم (۱۸ ویں صدی عیسوی) لکھتا ہے کہ اپنی تواریخی تصنیف کی خاطر مختلف نسخوں کا مقابلہ کرتے اور مواد اکٹھا کرتے ہوئے اس نے ملّا احمد کشمیری کی "مراۃ الاولیا" کے ایک خود نوشت مسودے کو دیکھا اور اپنی کتاب کا پانڈووں کے بارے میں باب لکھنے میں اس ماخذ سے استفادہ کیا۔ مذکورہ مسودہ اُس وقت اَودھ کے شاہی کتب خانہ میں تھا۔ اس میں حضرت شیخؒ کے اُس کلام کا فارسی ترجمہ معہ شرح شامل تھا جس کی تدوین و ترتیب خود شیخؒ کے زمانۂ حیات میں "نور نامہ" کے نام سے ہوئی تھی۔ ظاہر ہے کہ "مراۃ الاولیا" صرف ایک ترجمہ نہیں تھا بلکہ کلامِ شیخ کی مکمل شرح بھی تھا۔ اس تعلق سے کشمیری ادب کے طالب علموں کے لیے یہ تصنیف (مراۃ الاولیا) بہت بڑی اور بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔ لیکن بدقسمتی سے اس کی بازیافت کے لیے کوئی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ یہی اہمیت مصنّفِ موصوف کی "وقائع کشمیر" قاضی ابراہیم کی "تاریخ کشمیر" اور بابا ادہمی کی "تذکرۂ اولیائے کشمیر" کو حاصل ہے۔

کتی پنڈت (قطب الدّین) سنسکرت کا ممتاز عالم تھا جو حضرت شیخؒ کے اشعار کو دمِ تخلیق ہی شاردا رسم الخط میں لکھتا تھا۔ یہ اہم دستاویز بھی دستیاب نہیں ہے، نہ ہی بعد کے ریشی ناموں یا تذکروں میں اس کے اقتباسات کو جگہ ملی ہے۔ بعد کی تمام تاریخیں اور تذکرے فارسی کے اُن علماء کے تحریر کردہ یا مرتب کردہ ہیں جو شاردا رسم الخط سے ناواقف تھے اس

لیے وہ اس اہم دستاویز کا مطالعہ نہ کر سکے جو نسیان کے ملبے کے نیچے دبی رہی۔
اپنے موضوع سے متعلق اوّلیں تحریروں کی عدم موجودگی کے نتیجے میں ہم اپنی معلومات سولھویں صدی کے دوران یا اس کے بعد لکھے گئے تذکروں، ریشی ناموں، چک دور کے اواخر یا اس کے بعد لکھی گئی متعدد تاریخوں میں ادھر ادھر بکھرے پڑے مواد اور ان عمومی مگر مضبوط روایات پر استوار کرنے پر مجبور ہیں جو ہماری تاریخ کا جزو لاینفک بن گئی ہیں۔ یہ مآخذ خاص طور پر مندرجہ ذیل پر مشتمل ہیں:

۱۔ ریشی نامہ لامیہ از حضرت داؤد خاکیؒ (۱۵۲۱ء - ۱۵۸۵ء) — اس فارسی قصیدے میں شاعر نے اپنے ہمعصر ریشی یعنی اسلام آباد کے بابا ہردی ریشی کے حالاتِ زندگی بیان کیے ہیں۔ اس میں ریشی تحریک کے حوالے دیے گئے ہیں اور ساتھ ہی اس کے قاید حضرت شیخ نورالدینؒ کے بارے میں بعض معلومات بھی شامل ہیں۔ تاہم اس میں حضرت شیخؒ کی زندگی اور ان کے مشن کے تعلق سے کوئی کارآمد مواد نہیں ملتا۔

۲۔ نور نامہ از بابا نصیب غازیؒ — حضرت بابا نصیبؒ، حضرت بابا داؤد خاکیؒ کے نامور مرید تھے۔ حالانکہ وہ ریشی مسلک سے تعلق نہیں رکھتے تھے لیکن انھوں نے تمام عمر ترکِ لحم کیا۔ وہ فارسی زبان، دینیات اور تصوّف کے ممتاز عالم تھے اور انھوں نے کشمیر کی تاریخ اور یہاں کے ادب کا بڑا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اپنے "تذکرۂ مشائخ کشمیر" میں انھوں نے ریشی سلسلہ اور اس کے مشن کے مقصد پر تفصیل کے ساتھ لکھا ہے اور کشمیر کے نامور ریشیوں بشمول دیگر سلسلوں کے صوفیوں کے سوانحی خاکے قلمبند کیے ہیں۔ تاہم ان کا "نور نامہ"، جو ۱۶۳۰ء میں لکھا گیا ہے، حضرت شیخؒ سے مخصوص کتاب ہے۔

فاضل مصنّف کی دلچسپی زیادہ تر حضرت شیخؒ کی زندگی کے متصوفانہ پہلوؤں سے رہی ہے۔ اس میں جو صوفیانہ حکایات بیان ہوئی ہیں، ان سے حضرت شیخ کی حیات اور ان کے مشن کے بارے میں حقائق کو مشکل ہی سے الگ کیا جا سکتا ہے۔ مصنّف نے بہت زیادہ اشعار درج کرنے کی بجائے فارسی میں ان کا خلاصہ بیان کیا ہے۔

ان جملہ کوتاہیوں کے باوجود "نور نامہ"، کو حضرت شیخ اور ان کے ساتھیوں کے بارے

میں بنیادی ماخذ کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ کتاب کلام شیخ کے بیش تر حصے، اس کے اہم مضامین اور اس کی مقبولیت کے بارے میں بعض فکر انگیز حقائق بیان کرتی ہے۔ تاہم تجاوزات کے انبار سے حقائق کو بڑی مہارت اور چھان پھٹک کے ساتھ الگ کرنے کی ضرورت ہے۔

۳۔ بابا نصیبؒ کے قابل احترام مرید حضرت داوود مشکواتی کی تصنیف "اسرار الابرار" ۱۶۵۴ء میں تحریر ہوئی۔ یہ مرقع فارسی میں ہے اور ریشی سلسلہ اور اس کے قائد، دونوں کے بارے میں قابلِ قدر معلومات بہم پہنچاتی ہے۔ مصنف نے اگرچہ اپنے مرشد کے طریقۂ کار سے مختلف موقف اختیار کیا ہے تاہم وہ مآخذ اور ان کی قدر و قیمت کا خصوصی ذکر کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ ان حالات میں یہ کتاب محض الجھنوں میں اضافہ کرتی ہے۔ پھر بھی یہ حضرت شیخ کے امتیاز و انفراد اور کشمیری زبان و ادب کے تئیں ان کی دین سے متعلق مواد فراہم کرتی ہے۔

۴۔ پٹھانوں کے دورِ حکومت میں افغان گورنر کا مشیر راجہ سکھ جیون مل (۱۷۵۶ء۔ ۱۷۶۴ء) کشمیر کو مرکز (یعنی کابل) سے آزاد کرنے میں کامیاب ہوا اور عوام کی خود اعتمادی اور احساس شجاعت کو بحال کرنے کے لیے اس نے کشمیر کی شاندار تاریخ کو نظم کرنے کا کام پانچ برگزیدہ فارسی شعراء کو سونپا۔ اس نے ان شاعروں کو رزمیہ مثنوی کی ہیئت میں اور فردوسی کے شاہنامہ کے طرز پر کشمیر کی منظوم تاریخ لکھنے کی ہدایت دی۔ ان شعراء میں سے ملّا عبدالوہاب شائق کو حضرت شیخ نورالدینؒ کی حیات اور ان کے کارناموں کے خصوصی حوالے کے ساتھ ریشی تحریک کے آغاز و ارتقاء سے متعلق حصہ سونپا گیا۔ شائق نے یہ کام ۱۷۶۴ء میں مکمل کیا۔ اس نے سات ہزار اشعار میں ریشی تحریک کی تاریخ، اس کے قائد کے حالاتِ زندگی اور شیخ کے جانشینوں کے کارناموں کو بیان کیا۔ یہ تصنیف بہت حد تک بابا نصیب غازیؒ کی نثری تصنیف پر مبنی ہے۔

۵۔ ۱۷۶۶ء میں فارسی کا ایک اور بڑا شاعر بہاء الدین سری نگر میں پیدا ہوا۔ وہ فارسی ادب، تصوف اور تاریخ کا ممتاز عالم تھا۔ اس نے نظامی گنجوی کے طرز پر فارسی میں خمسہ کے نام سے پانچ مثنویاں لکھیں۔ ان میں سے ایک مثنوی "ریشی نامہ روح افزا" ہے۔ پانچ ہزار

اشعار پر مشتمل یہ طویل نظم بھی حضرت شیخ کی زندگی کے بارے میں چند معلومات فراہم کرتی ہے لیکن اس کا بیشتر حصہ ان کی کرامات اور فوق الفطری کارناموں سے متعلق ہے۔

۶۔ اٹھارویں صدی کی آخری دہائیوں میں چرار شریف کے ایک بڑے عالم، محقق اور شاعر بابا محمد کمال نے فارسی نثر میں "ریشی نامہ عنبر شمامہ" لکھی۔ اس ضخیم تصنیف میں مصنف نے پہلی بار حضرت شیخ کا زیادہ سے زیادہ اصل کلام درج کیا۔ اس نے ہر شعر اور ہر نظم کا پس منظر بھی پیش کیا ہے۔ تاریخ اور ادب کے طالب علموں کے لیے یہ کتاب بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ تاہم حضرت شیخ کے مختلف اشعار کے ساتھ کوئی نہ کوئی پس منظر منسوب کر کے مصنف نے ان کے علامتی اور استعاراتی دائرۂ امکانات کو محدود کر دیا ہے۔ یوں اس امر نے ان کی شاعری کی آفاقیت اور ابدیت کو بھی محدود کر دیا ہے۔ کلام شیخ کے پس منظر کے بطور بیان کی گئی یہ فرضی کہانیاں اصل تاریخی حقائق کے ساتھ خلط ملط ہوئیں، اور پھر مصنف موصوف نے مآخذ کا واضح تذکرہ بھی نہیں کیا ہے۔ تاہم اس کا بیان ہے کہ اُس نے اُن نایاب مسودوں سے کافی استفادہ کیا جو اسے ریاست کے مختلف علاقوں میں حاصل ہوئے اور اس زبانی روایت سے بھی کہ جو اس وقت دستیاب تھی۔

نثری تصنیف کے کچھ ہی عرصہ بعد بابا کمال نے مثنوی کی ہیئت میں فارسی میں "نورنامہ" لکھا۔ یہ کتاب کئی ہزار اشعار پر مشتمل ہے اور اس کی زبان سادہ، شستہ اور صاف ہے۔ اگرچہ اس سے اُس مواد میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا جو ان کی نثری تصنیف میں شامل ہے تاہم اس میں شک نہیں کہ یہ حضرت شیخ کی بعض نظموں اور اشعار کا آسان ترجمہ پیش کرتی ہے۔

۷۔ ایک اور عالمانہ تصنیف "روضۃ الریاض" ہے۔ یہ ۱۸۴۰ء میں چرار شریف کے بابا محمد خلیل نے فارسی میں لکھی۔ پانچ سو سے زیادہ صفحات پر مشتمل یہ کتاب بھی کم و بیش اسی مواد پر مبنی ہے۔ تاہم یہ حضرت شیخؒ کی شاعرانہ صلاحیتوں کے بعض نئے پہلوؤں کو نمایاں کرتی ہے۔ اس کا اسلوب رنگین و مرصع ہے اور زبان لفظی میناکاری سے پُر ہے۔ علاوہ ازیں مصنف کا منظوم ترجمہ زیادہ صحیح اور اصل کے مطابق ہے۔ اس سے ہمیں ان اشعار کے صحیح معنیٰ دریافت کرنے میں مدد ملتی ہے جو ناقص اور نامکمل خط میں تحریر کیے

گئے تھے ۔ یہ کتاب اس اعتبار سے بھی انتہائی قابلِ ذکر ہے کہ اس میں بابا خلیل کی فارسی غزلوں اور نظموں کی ایک اچھی تعداد شامل ہے جو اس نے حضرت شیخؒ کی مدح میں کہی ہیں۔

۸۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، حضرت شیخؒ کی زندگی میں یا ان کے انتقال کے فوراً بعد لکھی گئی فارسی تاریخوں کے بارے میں کافی معلومات درج تھیں لیکن بدقسمتی سے ان میں سے تاحال کوئی بھی دستیاب نہیں ہے۔

سیّد علی کی "تاریخ کشمیر" (۱۵۷۹ء) "بہارستان شاہی" (تصنیف ۱۶۱۴ء) تاریخ ملک حیدر چاڈورہ (۱۶۲۰ء) خواجہ اعظم دیدہ مری کی "واقعات کشمیر" (۱۷۴۷ء) نرائن کول عاجز کی "تاریخ کشمیر" اور پیر حسن شاہ کھویہامی (متوفی ۱۸۹۸ء) کی لکھی ہوئی تاریخ ـــــ سبھی فارسی میں ہیں اور ان میں عارف شاعر حضرت شیخؒ سے متعلق مکمل بیانات شامل ہیں۔ لیکن ان مصنّفوں نے یا تو حضرت بابا نصیبؒ کی رائے کا تتبع کیا ہے یا پھر ان کے مرید حضرت بابا مشکواتی کی رائے کا۔

بیسویں صدی کے اوائل میں غلام محی الدین صوفی نے کشمیر کی تاریخ ترتیب دینے اور لکھنے کے لیے بڑی عرق ریزی سے کام کیا جو "کشیر" کے نام سے انگریزی میں دو جلدوں پر مشتمل ہے ۔ اس کتاب میں فاضل مصنّف نے حضرت شیخؒ اور ان کے کارناموں کو پہلی بار انگریزی داں طبقے میں متعارف کیا۔ اس کے ساتھ ہی دوسری یادگار تصنیف ایک اور مؤرخ پی، این، کے بامزئی کی شائع ہوئی اور یہ بھی حضرت شیخؒ کے بارے میں مفصّل بیانات پیش کرتی ہے ۔ ۱۹۴۴-۴۵ء میں ممتاز کشمیری شاعر اور ناقد مرحوم عبدالاحد آزاد (متوفی ۱۹۴۸ء) نے تین جلدوں میں کشمیر کی ادبی تاریخ لکھی جس میں انھوں نے حضرت شیخ العالم کی زندگی اور ان کے کارناموں کا بھی مفصّل جائزہ لیا ہے۔

۹۔ حضرت شیخؒ کی حیات اور ان کے مشن کے تعلق سے حقائق کا صحیح تجزیہ اور ان کی چھان پھٹک کرنے کے لیے ایک اہم کسوٹی خود ان کے کلام کی داخلی شواہد سے فراہم ہوتی ہے۔ ان کا کلام اس گرد و پیش اور ماحول کو سامنے لاتا ہے جس میں اس عارف شاعر نے

زندگی بسر کی، یہاں تک کہ ان کے متعدد اشعار ان کی حیات کے بارے میں کافی معلومات بہم پہنچاتے ہیں۔

۱۰۔ آخر پر ایک ایسی دستاویز کا حوالہ دینا مناسب ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اسے ۱۴۰۸ء میں حضرت شیخؒ نے Execute کیا ہے۔ اگرچہ اس کا عنوان نہیں ہے لیکن بعض لوگوں نے اسے "خط ارشاد" کا نام دیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس دستاویز کی تصدیق خود سلطان نے کی ہے لہٰذا اس کی قدر و قیمت کو کمتر نہیں سمجھا جا سکتا۔ اس دستاویز کے استناد اور اس کے تعلق کے بارے میں کئی رائیں ملتی ہیں۔ متضاد آراء کے باوجود یہ دستاویز حضرت شیخؒ کی فضیلت اور ان کے زمانے میں عوام پر ان کے گہرے اثرات کا جائزہ لینے کے لیے ناگزیر ماخذ میں سے ایک ہے۔

ان تمام ماخذ کی بنیاد پر حاصل شدہ مواد کی جانچ پڑتال کی گئی ہے۔ تنقیدی نظر سے اس کی چھان پھٹک کی گئی ہے، منطقی انداز سے جائزہ لیا گیا ہے اور معتبر بیانات کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ ردّ و قبول کا عمل حقائق کے سرسری جائزے کا نہیں بلکہ باضابطہ اور مدلّل بحث کا تقاضا کرتا ہے جو موجودہ کتابی سلسلے کے دائرے سے باہر ہے۔

ان مباحث سے اگر اتنا ہی ہو کہ محققین کے اندر حضرت شیخ نورالدینؒ کے بارے میں عصری مواد کے سراغ لگانے کا شوق اور سچی لگن پیدا کریں تو یہ اس مونوگراف کی بہت بڑی کامیابی قرار پائے گی اور یوں یہ ایک تاریخی مقصد پورا کرے گا۔

حیات

حضرت شیخ نور الدینؒ کے آباد اجداد اصل میں کشتواڑ کے تھے جو چھوٹی سی خود مختار سلطنت تھی لیکن بعد میں ڈوگرہ حکمران مہاراجہ گلاب سنگھ (۱۸۴۶ء - ۱۸۵۷ء) نے اسے ریاست جموں وکشمیر کے ساتھ شامل کیا تھا۔ اب یہ ڈوڈہ ضلع میں سب ڈویژن ہے حضرت شیخؒ کے اجداد راجپوت تھے جن کے پاس کشتواڑ کی آزاد سلطنت میں جاگیر تھی۔ ان کے جدامجد اوگراٹیگ ایک مقامی لڑائی میں شکست کھا گئے اور اپنے بال بچّوں اور بھائیوں کے ساتھ رام دیو (۱۲۵۲ء - ۱۲۷۳ء) کے دَورِ حکومت میں کشمیر چلے آئے۔ یہاں انھوں نے تلسر[1] کے تعلقہ دار کھمنی وانو کے دربار میں پناہ لی۔ ان کے بھائی نے نسبتاً چھوٹی سی ریاست دَدرکوٹ[2] میں پناہ لی۔ اپنی قابلیت اور شجاعت کی بنا پر دونوں بھائی بالترتیب تلسر اور دَدرکوٹ میں محافظ فوج کے کمانڈروں کے اعلیٰ عہدوں پر پہنچے۔ تاہم کھمنی وانو کے جانشین کی شکست کے بعد اوگراٹیگ اپنے اہل و عیال کے ساتھ ایک اور چھوٹی ریاست گڈ ستھو[3] ہجرت کر گئے جہاں حالات نے حضرت شیخؒ کے والد سلر سنز کو مارا مارا پھرنے پر مجبور کر دیا۔

اسی دوران میں دَدرکوٹ میں ایک مقامی لڑائی میں، جس میں راجا بھی مارا گیا، اوگراٹیگ کے بھائی کے پرپوتے کے بیوی بچے مارے گئے اور صرف ایک شیرخوار بچّی حادثاتی

---

[1] ضلع بڈگام کے تحصیل چاڈورہ کا ایک گاؤں

[2] ضلع اننت ناگ میں ایک گاؤں

[3] تحصیل چاڈورہ میں ایک گاؤں

طور پر موت سے بچ گئی۔ جس وقت حملہ آوروں نے قتل وغارت کی وہ اپنی رضاعی ماں یعنی مقامی چوکیدار کی بیوی کی حفاظت میں تھی۔ چوکیدار اور اس کی بیوی نے اسے اپنی بچّی کی طرح پالا پوسا لیکن اسے حملہ آوروں کے غیض وغضب سے محفوظ رکھنے کے لیے اس کی ولدیت کو مخفی رکھا۔ اس بچّی کا نام 'سدَرہ' (سمندر) تھا۔

چوکیدار نے کھے جوگی پورہ نام کے گاؤں ہجرت کی جہاں اس نے شب گر کا کام اختیار کیا۔ یہ بچّی ابھی چھوٹی تھی کہ اس کی سگائی ایک ایسے جوان کے ساتھ کی گئی جس کی بیوی مرچکی تھی اور جو پہلے سے دو بچّوں کا باپ تھا۔ لیکن شادی تکمیل کو نہیں پہنچی۔ اس سے پہلے کہ دلہن شوہر کے گھر جاتی، موخرالذکر کی موت واقع ہوئی۔ نیک دل چوکیدار کو اس کے یتیم بچّوں پر ترس آگیا اور ان کی پرورش کے لیے وہ انھیں گھر لے آیا۔

چوکیدار سدرہ کو کلگام کے مبلّغ اور عارف حضرت سید حسین سمنانیؒ کے پاس لے گیا اور بچّی کی حالت زار بیان کی۔ سیّد نے بچّی اور اس کے سرپرست، دونوں کو روشن مستقبل کا یقین دلایا لیکن ساتھ ہی چوکیدار کو یہ تنبیہہ کی کہ انھیں (سیّد کو) مطلع کیے بغیر بچّی کی شادی نہ کی جائے۔

اوگراٹیگ کی اولاد میں سے سلرسنز، جنھیں گڈستھو سے نکال باہر کیا گیا تھا، کافی عرصہ تک مارے مارے پھرتے رہے اور آخر کار اس جگہ پہنچے جہاں ایک مقامی بزرگ یاسمن ریشی تفکّر کیا کرتے تھے۔ سلرسنز، یاسمن ریشی کے مُرید بن گئے، مشرّف بہ اسلام ہوئے اور ان کا نیا نام سالار الدین رکھا گیا۔ اسی دوران میں چوکیدار بھی فوت ہوا اور بدقسمت لڑکی سدَرہ فیض وبرکت کی خاطر یاسمن ریشی کے پاس گئی جن کی وساطت سے وہ سالار الدّین سے متعارف ہوئی۔ دونوں کو معلوم ہوا کہ وہ ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ یاسمن ریشی نے ان کی شادی کرائی اور اس کے بعد وہ دونوں کھے جوگی پورہ گاؤں میں چوکیدار کے مکان میں رہنے لگے۔

تِلسر اور ددَرکوٹ، دونوں علاقوں میں یہ گھرانے "سنز" کے نام سے جانے جاتے تھے جو بعض علماء کے خیال میں لفظ "سین" کا بگڑا ہوا روپ ہے۔ چونکہ سین خاندان نے کچھ

عرصہ تک کشتواڑ پر حکومت کی تھی اس لیے یہ علماء حضرت شیخ کے آباو اجداد یعنی سنز گھرانے کو اسی خاندان سے ملانے کی طرف مائل نظر آتے ہیں۔ تاہم یہ رائے اس اعتبار سے غلط ہے کہ "سنز" خالص کشمیری لفظ ہے جس کے معنی قلعہ کے محافظ کے ہیں۔

پیر حسن شاہ اپنی تصنیف "تاریخ کشمیر" کی دوسری جلد میں لکھتے ہیں:

"بٹوارے (Balkanisation) کے دوران تعلقہ دار خاص علاقوں پہ حکومت کرتے تھے اور اپنی اپنی ریاستوں یا تعلقوں کو قلعوں کی تعمیر کے ذریعہ سے علیحدہ کرتے تھے۔ ایسی جگہیں کہ جہاں یہ قلعے تعمیر کیے گئے اپنے ناموں کے ساتھ 'کوٹ' کے لاحقے کے ساتھ موسوم ہیں مثلاً زینہ کوٹ، دَدر کوٹ وغیرہ قلعہ کا انتظام جس افسر کے ہاتھ میں ہوتا تھا وہ 'سنز' کہلاتا تھا۔"

اس طرح یہ ظاہر ہے کہ پدری و مادری دونوں طرف سے حضرت شیخؒ کے اجداد تلسر اور ددر کوٹ کے قلعہ دار مقرر ہوئے تھے۔ اسی وجہ سے یہ گھرانے "سنز" کہلاتے تھے۔ خود شاعر (شیخؒ) کہتے ہیں کہ "میرے والد اور میری والدہ دونوں سنز خاندان سے ہیں"۔ سالار سنز اور سدرہ کے اس جوڑے کی ازدواجی زندگی کا عرصہ بہت مختصر رہا۔ چنانچہ حضرت شیخؒ کے پیدا ہوتے ہی ان کے والد نے وفات پائی۔ شیخ نورالدینؒ سالار اور سدرہ کے اکلوتے چشم و چراغ تھے۔

حضرت شیخؒ کلگام تحصیل کے کھے گاؤں میں پیدا ہوئے، یہاں ان کے والدین آباد ہوئے تھے۔ مقامی روایت اگرچہ کھے کے ملحق گاؤں کیموہ کو حضرت شیخ کی جائے پیدائش ظاہر کرتی ہے لیکن ان کا اپنا کلام اس روایت کی نفی کرتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "اسی کھے گاؤں میں میری ولادت ہوئی"۔ روایت بھی تاہم بے بنیاد نہیں ہے۔ حضرت شیخ نے اپنے بچپن اور جوانی کے ایام کیموہ میں ہی گزارے۔ اور وہ اسی گاؤں میں تھے کہ جب وہ عملی زندگی سے کنارہ کش ہوگئے۔ ان کے والدین، ان کی بیوی اور بچے۔ سب وہیں دفن ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انھوں نے اپنے اشعار میں کیموہ کو اپنی جائے سکونت لکھا ہے۔ پس یہ ظاہر ہے کہ حضرت شیخؒ کی پیدائش کے بعد ان کے گھرانے نے کھے سے یہاں ہجرت کی۔ تحریری مواد سے

یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت شیخ نے کھے گاؤں کے نمبر دار کی زمین کاشت کی تھی جس سے وہ صاحب ثروت بن گئے۔ لگتا ہے کہ ان کا عیال مستقل طور پر کیموہ ہجرت کر گیا تھا لیکن حضرت شیخؒ اپنے پیشہ کے سلسلے میں وہاں جایا کرتے تھے۔

حضرت شیخ کی صحیح تاریخ ولادت کے بارے میں مقامی مؤرخین کے درمیان کافی حد تک اختلافِ رائے پایا جاتا ہے۔ بابا مشکواتیؒ نے اپنے مُرشدِ مکرّم حضرت بابا نصیب غازیؒ کی رائے سے مختلف رائے قائم کی ہے۔ دونوں نے کسی ماخذ کا حوالہ نہیں دیا ہے۔ بابا نصیبؒ نے ان کا سال پیدائش ۱۳۷۷ء بتایا ہے جبکہ ان کے مُرید کا بیان ہے کہ حضرت شیخ ۱۳۵۵ء میں پیدا ہوئے۔ بعد کے تذکرہ نویسوں اور مؤرخوں نے کم و بیش یا تو بابا نصیب غازی کی رائے کا تتبع کیا ہے یا پھر ان کے مُرید کی رائے کا۔ انیسویں صدی کے مؤرخ پیر حسن نے بابا مشکواتی کی رائے کی تصدیق کی۔ اس نے یہ رائے اس دعویٰ کے ساتھ معتبر قرار دی کہ اس نے حضرت شیخؒ کے زمانے کی ایک تاریخی تصنیف مُلّا احمد کی وقائع کشمیر سے استفادہ کیا۔ تاہم وہ حالات کہ جن میں حسن کے بیان کے مطابق اس کا مطالعہ کرنے کے فوراً بعد ہی یہ نادر نسخہ کھو گیا، اس کے دعویٰ کے اعتبار کو کم کرتے ہیں۔ اگر ہم اس کے بیان کا یقین بھی کر لیں پھر بھی یہ نتیجہ نکالنا مشکل ہے کہ اسے مسودہ کے غائب ہو جانے کا اندیشہ تھا اس لیے اس نے تمام اہم سنین وغیرہ کو نقل کر کے اپنے پاس محفوظ رکھا۔ پس اس رائے سے مختلف رائے قائم کرنے کی کوئی وجہ نہیں جو اس سے قبل بابا نصیب غازیؒ نے قائم کی تھی۔ حضرت شیخؒ کے مقبرے پر کتبے کی کندہ عبارت سے اُلجھن میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر ان تمام پہلوؤں کا جائزہ لیں تو اس سے زیرِ نظر کتاب طوالت کا شکار ہو گی۔ ماقبل کی تحریروں کو ترجیح دیتے ہوئے یہ مسلّم ہے کہ حضرت شیخ نورالدینؒ کی ولادت کھے گاؤں میں ۱۳۷۷ء کو ہوئی۔

ان کی ولادت اور حیات کے ساتھ کچھ کہانیاں جُڑی ہوئی ہیں۔ روایت ہے کہ سنز جوڑے کو اپنی شادی کے بعد بیٹے کی بڑی خواہش تھی۔ چودھویں کی رات کو کھے گاؤں میں چوکیداری کے فرائض انجام دیتے ہوئے سالارالدّین گاؤں کے مضافات تک نکل گیا اور ایک سادھو

کی کٹیا کے سامنے کچھ دیر ٹھہرا۔ سادھو ایک نجومی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک پہنچا ہوا روحانی بزرگ بھی تھا۔ سکوتِ شب میں سالار کے کان میں سادھو کی آواز سنائی دی جو اپنی بیوی سے کہہ رہا تھا کہ آج ہی کی رات پَو پھٹنے سے پہلے کھے جوگی پورہ کے چشمے میں سے گلابوں کا ایک گچھا اُبھر آئے گا اور جو کوئی نیک بخت خاتون اس کی خوشبو سونگھ لے گی وہ سنسار کے بہت بڑے ولی کو جنم دے گی۔ گلاب لمحے بھر میں غائب ہو جائیں گے اور ان کی جگہ سوسن کا گچھا اُبھر آئے گا۔ جو خاتون ان کو چُن لے گی اور ان کی خوشبو سونگھ لے گی اس کی قسمت میں بھی ایک ولی کی ماں بن جانا ہو گا اگرچہ یہ ولی نسبتاً کم تر رُتبہ کا ہوگا۔

سالار الدّین گھر واپس دوڑے اور انھوں نے یہ واقعہ اپنی بیوی کو سنایا۔ دونوں چشمے کی طرف دوڑ پڑے اور وہاں پہنچنے پر اس کے صاف اور دودھیا پانی سے گلابوں کا دستہ اُبھرتے ہوئے دیکھا۔ سدرہ نے اس گچھے کو اُٹھایا اور اس کی خوشبو کو سانس کے ساتھ اندر کھینچا۔ گھر لوٹتے ہوئے انھوں نے سادھو اور اس کی بیوی کو اِس طرف آتے ہوئے دیکھا۔ یوگی نے سدرہ کے چہرے بشرے سے بھانپ لیا کہ وہ مقدّس خوشبو سے مسحور ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ نَو ماہ بعد سدرہ نے اسی گاؤں میں ۱۰ ذی الحج (بقرعید) ۱۳۷۷ء میں ایک بیٹے کو جنم دیا۔

یہ بھی روایت ہے کہ پیدائش کے بعد تین دن تک بچّے نے ماں کی چھاتیوں کا دودھ نہیں پیا۔ جس سے والدین بہت پریشان ہو گئے۔ تیسرے دن شام کو عظیم عارفہ اور ممتاز شاعرہ لل دیدؒ، سدرہ کے گھر پہنچیں، بچّے کو گود میں اٹھایا، سینے سے لگایا اور اس کے کان میں کہا:

تم جنم لینے سے نہیں شرمائے
تو اب پینے سے کیوں شرماتے ہو

پھر انھوں نے بچّے کو اپنی پچکی ہوئی چھاتیوں کو چوسنے پر آمادہ کیا اور یوں اس بچّے نے ایک پہنچی ہوئی عارفہ کی نگرانی میں دنیا کی پہلی مسرّت کو چکّھا۔ بعد کے ایک کشمیری شاعر نے اس واقعہ کا خلاصہ یوں بیان کیا ہے ؎

اے کائنات کے ماہِ کامل
تمہاری پیدائش کے فوراً بعد
لل عارفہ نے تمہارے لیے اپنی گود میں پالنا سجایا
اور تمہیں زندگی کا شربت پلا دیا
مرحبا، مرے آقا! اے سخی نورالدّین

نوزائیدہ بچّے کو جب تسلّی ہوئی تو لل دید نے اسے اس کی ماں سدرہ کو اس ہدایت کے ساتھ لوٹایا کہ "لو، میرے روحانی وارث کی پرورش کرو۔"

یہ بھی روایت ہے کہ اس نوزائیدہ بچّے کا، جسے والدین پیار سے نُند (پاک) کہہ کر پکارتے تھے، نورالدّین نام حضرت سیّد حسین سمنانیؒ نے رکھا تھا۔ چنانچہ بعد میں حضرت شیخؒ نے اسی لفظ "نُند" یا "نند ریشی کیموہ" کو قلمی نام کے بطور استعمال کیا۔

حضرت نورالدّین کے بچپن کے بارے میں بہت کم معلومات ملتی ہیں لیکن ظاہر ہے کہ وہ اپنی عمر کے دوسرے بچّوں سے زیادہ ذہین تھے اور اسی لیے ان کے کارناموں کو زیادہ تر ان کی روحانی قوت سے ہی منسوب کیا جاتا تھا۔ ان کی جوانی کے بارے میں جاننے کی طرف نہ ہی مؤرخین نے توجہ دی اور نہ ہی تذکرہ نگاروں نے۔ آن کی زیادہ تر دلچسپی حضرت شیخؒ کے کشف و کرامات سے رہی۔ اس لیے انھوں نے صرف ایسے واقعات اور روایات کو اکٹھا کر کے رقم کیا جو ان کے موضوعات سے مطابقت رکھتے تھے۔ انھوں نے **حضرت شیخ** کو ایک انسان کی حیثیت سے دیکھنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ تاہم کچھ حقائق جو ان کی ابتدائی زندگی سے متعلق خود ان کے کلام میں ملتے ہیں اور جو روایت میں گہرے طور پر پیوست ہیں، ضرور ان کے بچپن اور جوانی کے پوشیدہ پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں۔

ماں اپنے بچّے نُند کو گاؤں کے مکتب لے گئیں جہاں مولوی نے شروع میں اسے ع.بی کے پہلے دو حروف یعنی "الف" اور "ب" پڑھائے۔ شاگرد نے حرف 'الف' کو تو خوشی سے دہرایا لیکن دوسرے حرف کو نہیں پڑھا۔ استاد نے جب نُند کو ڈانٹا تو اس نے جواب میں سمجھایا کہ "جناب الف اللہ ہے جو لاشریک اور ہمہ جائی ہے۔ 'ب' سے دوئی پیدا

تھا کہ نند ایک غیر معمولی لڑکا ہے۔ عظیم یوگنی لل دید نے اسے اپنا "روحانی وارث" قرار دیا تھا۔ حضرت سیّد حسین سمنانیؒ جنھیں حضرت میر سیّد علی ہمدانیؒ نے اس بچّے کی تربیت کا کام سونپا تھا، اسے کلگام میں اپنے تکیہ پرلے جایا کرتے تھے۔ سدرہ خود بھی سیّد سمنانیؒ کی ارادت مند تھیں اور پھر وہ ایک پاک طینت خاتون بھی تھیں، نماز کی پابند تھیں اور رشد و ہدایت اور فیض و برکت کے لیے اکثر حضرت سمنانیؒ کے تکیہ پر حاضری دیتی تھیں۔ دنیادار بھی تھیں کہ غربت کے باوجود اپنے بیٹے کو تعلیم سے بہرہ ور کرنے کی مسلسل کوششیں کرتی رہیں۔ ان تمام حالات کے تناظر میں اپنے سوتیلے بیٹوں شش اور گندر کی مبینہ غیر اخلاقی اور ناجائز حرکات کے ساتھ سدرہ کو کسی بھی طرح وابستہ کرنا مناسب نہیں ہوگا۔

ذکر ہو چکا ہے کہ حضرت سیّد علی ہمدانیؒ نے حضرت سیّد سمنانیؒ کو نور الدین کی دیکھ بھال کا کام سونپا تھا اور یہ کہ سدرہ حضرت سمنانی کی مرید بھی تھیں، اس لحاظ سے شیخ کے ساتھ سمنانی کے بڑے قریبی تعلقات رہے ہوں گے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ ان کا تعلق باہمی مفاد اور سوجھ بوجھ کا تعلق تھا۔ بابا نصیب ان کی باہمی قربت کا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ سیّد سمنانیؒ حضرت شیخؒ کے کلام کے اس قدر دلدادہ تھے کہ اگر موخر الذکر دن میں اپنے اشعار سنانے ان کے پاس نہ آتے تو اوّل الذکر ویشو دریا پار کر کے خود نور الدینؒ کے گھر جاتے۔ اس واقعاتی روایت سے ظاہر ہے کہ حضرت شیخ اوائل عمر ہی سے شعر کہا کرتے تھے اور سماجی زندگی سے ان کے کنارہ کش ہونے سے بہت پہلے ہی ان کے فن کے مدّاحوں کا حلقہ موجود تھا۔

اس میل جول نے دونوں کو ذہنی اور باطنی طور پر ایک دوسرے کے اور زیادہ قریب کر دیا۔ اس طرح حضرت سیّد سمنانیؒ، حضرت شیخ کے پہلے دوست، رہبر اور مرشد قرار دیے جا سکتے ہیں۔

سلطان شہاب الدّین اور سلطان قطب الدّین کی حکومتوں کے دوران مشہور وسط ایشیائی مبلغ، عارف، عالم اور شاعر حضرت میر سیّد علی ہمدانیؒ تین مرتبہ کشمیر آئے۔ آپ نے نہ صرف کشمیریوں کی مذہبی زندگی میں انقلاب لایا بلکہ ان کی زندگی کے ہر شعبہ کو متاثر کیا، تاریخ کا رخ بدل ڈالا اور کشمیر میں ایک نئے تمدّنی تصوّر کی بنیاد ڈالی۔ آپ دوسری مرتبہ

غالباً یہ کہانی بھی بعد کے تبصرہ نگاروں کی پیدا کردہ الجھن کا نتیجہ ہے جنھوں نے حضرت شیخؒ کی ہر شعری تخلیق کے لیے کوئی نہ کوئی پس منظر گڑھ لیا ہے اور یوں مذکورہ نظم کو کسی پس منظر کے ساتھ جوڑنے کے لیے یہ حکایت گڑھ لی گئی ہے۔ یہ نظم موضوع اور فن کے اعتبار سے اس قدر ریختہ ہے کہ کوئی بھی صاحبِ بصیرت یہ نہیں مان سکتا کہ ایسا شاہکار کسی چھوٹے بچّے کی بے ساختہ تخلیق ہوگی اور وہ بھی اس پریشان کن صورت حال میں جب اس کے ساتھی رات کے وقت مکان میں نقب لگا رہے تھے۔ تاہم یہ سارا قصّہ حضرت شیخ کو بدنام کرنے کے منصوبے کی ایک کڑی ہے یا پھر ان کے کیریر کو تباہ کرنے کے لیے شش اور گندرر کی سازش۔ یہ باور کرنا مشکل ہے کہ سدرہ جیسی ماں ناپسندیدہ لوگوں کے ساتھ اپنے بیٹے کی صحبت تک کو برداشت کر سکتی تھی۔ اگر انھیں اس بات کا بھی پتہ چلتا کہ ان کے سوتیلے بیٹوں نے کسی قابلِ اعتراض پیشہ کو اپنا مشغلہ بنایا ہے تو وہ اپنے بیٹے کو ان سے میل جول رکھنے کی ہرگز اجازت نہیں دیتیں۔ یہاں یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ سدرہ کے سوتیلے بیٹے ان سے الگ رہ رہے تھے جیسا کہ حضرت شیخ کے ایک شعر سے ظاہر ہوتا ہے۔

اس بات کا ذکر آگے ہوگا کہ حضرت شیخؒ کے خلاف سازشیں کی گئی تھیں اور انھیں بدنام کرنے کی ایک مہم بھی شروع کی گئی تھی۔ ایسے حالات میں یہ بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ یہ قصّے اسی مہم کا حصّہ ہیں۔ حضرت شیخ کی زندگی میں سازشی لوگ، چونکہ انھیں ضرر پہنچانے میں ناکام ہوئے اس لیے ان کے جانشینوں نے یہ عمل جاری رکھا اور بغض و عناد سے پُر تاریخ گڑھ لی۔

ذکر ہو چکا ہے کہ سدرہ پوری طرح سے واقف تھیں کہ ان کے فرزند کو غیر معمولی اوصاف ودیعت ہوئے ہیں۔ وہ اپنے بیٹے کو بُری صحبت میں ہرگز پڑنے نہیں دیتیں۔ انھیں معلوم تھا کہ جس بچّے کا حمل کرامائی گلدستے کی خوشبو سونگھ لینے سے ٹھہرا تھا اس کی قسمت میں ایک بہت بڑا ولی بننا لکھا ہے۔ برگزیدہ مبلغ، ولی، عالم اور رہنما حضرت میر سید علی ہمدانیؒ (جو چھ سالہ بچّے کو دیکھنے اس کے گھر آئے تھے) سے سدرہ کو معلوم ہوا

ہوتی ہے۔" مولوی بچّے سے برہم ہوا اور اسے اپنے مکتب سے نکال دیا۔

مایوس ہوئی ماں نے پھر بچّے کو ہنر سیکھنے کے لیے ایک جولاہے کے پاس لیا۔ ذہین بچّہ اپنے نئے استاد کے پاس اس پیشہ کا بڑی باریکی سے مشاہدہ کرتا رہا۔ اس نے دیکھا کہ کھڈ پر بُننے کی نال کو چلاتے ہوئے جولاہا استاد دھاگے کو دانتوں سے کاٹتا ہے اور اس کے کٹے ہوئے ٹکڑوں کو نگل جاتا ہے۔ کار آموز بچّے نے استاد کو تنبیہہ کی کہ تم اس مال کے خورد برد کرنے کے مرتکب ہوتے ہو جو تمارے سپرد کیا گیا ہے۔ استاد شرمندہ ہوا لیکن ایسے ہونہار لڑکے کی صحبت سے مستفیض ہونے کی بجائے اس کی ماں کو بلایا اور اسے یہ کہہ کر واپس لے جانے کو کہا کہ" یہ زاہد ہے اور دُنیوی کام نہیں سیکھ سکتا"۔ پریشان حال ماں اپنے بیٹے کو گھر واپس لے گئیں اور اپنے سوتیلے بیٹوں ششش اور گُندر سے گزارش کی کہ وہ اسے چوکیداری کی تربیت دیں۔ سالارالدین کی وفات کے بعد یہ دونوں بھائی گاؤں کے چوکیدار مقرّر ہوئے تھے۔

نُند کے ان دو سوتیلے بھائیوں نے تربیت دینے کی بجائے اسے بگاڑنے کی کوشش کی۔ اور بعد میں چوری کرنے پر اُکسانے کی کوشش کی۔ روایت ہے کہ ایک رات انھوں نے ایک گائے چُرائی۔ نُند کو یہ کام سونپا گیا کہ اسے گھر پہنچائے لیکن اس نے اسے راستے میں ہی چھوڑ دیا اور خود گھر چلا گیا۔ دوسری شب نُند سے برہم بھائی اسے ایک گھر میں لے گئے اور اس میں نقب لگا کر کمسن نُند کو ایک کمرے میں دھکیل دیا اور اسے قیمتی اشیا چرانے کی ہدایت کی۔ لڑکے نے اس غریب گھر کے بچّوں کو سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے پاکر انھیں اپنی چادر سے ڈھک لیا اور خالی ہاتھ مکان سے نکل آیا۔ تیسری شب ششش اور گندر نقب زنی کی غرض سے اسے ایک اور گھر میں لے گئے۔ گھر کے باہر کُتّے زور زور سے بھونک رہے تھے۔ نُند نے فی البدیہہ ایک طویل نظم کہہ دی جس کی ترجیع یوں ہے ؎

ہوٗن ہیوی، دیان وَو وَوٗ
(بھونکتا کتّا کہتا ہے، بو، بو)

ؔ "وَو"۔ کتّے کے بھونکنے کی آواز ہے۔ کشمیری میں اس لفظ کے معنی ہیں 'بیج بونا'۔

۱۳۷۹ء میں یہاں آئے جب حضرت شیخ نور الدینؒ مشکل سے دو سال کے تھے۔ ۱۳۸۳ء میں جب آپ تیسری اور آخری بار یہاں آئے تو حضرت شیخؒ کی عمر چھ سال کی تھی۔ اس بات پر باور کرنے کی کافی یقین بخش وجوہ ملتی ہیں کہ ان دو کے درمیان ایک بار ملاقات ہوئی اور حضرت امیرؒ نے حضرت شیخ کو ابتدائی تربیت دی۔ اس دعویٰ کے حق میں جو دلائل ہیں ان پر آگے بحث ہوگی۔

جوانی کے ایام میں حضرت شیخ کھے کے نمبردار کی زمین کے ایک بڑے رقبہ پر کھیتی کیا کرتے تھے۔ سخت محنت، لگن اور ایمانداری کی بدولت کسان شیخؒ نے بھاری فصل اُگائی جس نے نہ صرف زمیندار کو بلکہ گاؤں والوں کو بھی حیرت میں ڈال دیا۔ انھوں نے اسے ان کی محنت کی بجائے ان کی روحانی قوت سے منسوب کیا۔ وہ کھیت جن پر حضرت شیخ نے کاشت کی تھی، آج بھی اپنی مخصوص پہچان رکھتے ہیں۔ ان کھیتوں کے نام ناگہ نیر، ناگہ بقیر اور رباغہ بزین ہیں۔

حضرت شیخ نور الدینؒ نے جب اپنی معاشی حالت بہتر بنائی اور سماج میں اعلیٰ رتبہ حاصل کیا تو پندرہ سال کی عمر میں ان کی شادی ایک لڑکی سے طے ہوگئی جو اننت ناگ ضلع میں ترال کے ڈاڈہ سر گاؤں کے ایک زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کے اگلے سال باقاعدہ منگنی ہوئی اور شادی اس کے چار سال کے بعد کی گئی جب حضرت شیخ کی عمر بیس برس کی تھی۔ یہ جملہ حقائق حضرت شیخ کی ایک نظم سے اخذ ہوتے ہیں جو ذیل کے مصرعے سے شروع ہوتی ہے۔ ع

زاس تہ داپرو گوہ رہم منز لو[۱]

(پیدا ہوا تو میرے لیے منقش چوبی پالنا بنوایا گیا)

ان کی بیوی کا نام زَے تھا جو یا تو زیتون کا مخفف ہے یا زبیدہ کا۔ اکبر دین ان کے سسر تھے۔ یہ گھرانا کافی سیاسی اثر و رسوخ رکھتا تھا۔

تعجب ہے کہ ان کے سوانح نگاروں نے یہ تاثر قائم کیا ہے کہ حضرت شیخؒ بیکار تھے

---

[۱] اس نظم سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت شیخ کی پیدائش ایک کھاتے پیتے گھرانے میں ہوئی تھی۔

اور ان کے پاس نہ کوئی کام تھا نہ کوئی پیشہ۔ ان سوانح نگاروں نے ان کا ہر کام ان کی روحانی قوّت سے منسوب کیا ہے اور بعض اہم حقائق سے صرفِ نظر کیا ہے۔ کوئی بھی ماں، خاص طور پر سدرہ جیسی خاتون اپنے غیر ہنر یافتہ اور بے روزگار بیٹے کی شادی نہیں کرے گی۔ اگر ماں کی ممتا ان باریکیوں سے صرف نظر کر بھی لے تو بھی کوئی عزّت دار گھرانا (جیساکہ حضرت شیخ کا سسرال تھا) اپنی چہیتی بیٹی کی تقدیر کسی ایسے بے روزگار نوجوان کے ساتھ نہیں جوڑ دے گا جس کی کوئی معاشی حیثیت یا گھر یلو املاک نہ ہو۔ ان حالات میں یہ حضرت شیخؒ کی صلاحیت اور محنت کی کشش ہی تھی کہ جس نے اکبر دین کو ایک دُور دراز علاقے میں اپنی بیٹی کو بیاہنے پر آمادہ کیا۔

ایک زرعی مزدور کی حیثیت سے حضرت شیخؒ کو جو سخت محنت کرنا پڑی اس کے باوجود انھوں نے روحانی تفکّر اور مذہبی عمل کو نہیں چھوڑا۔ بابا نصیبؒ کی تحریروں سے یہ مسلّمہ ہے کہ حضرت شیخ، حضرت سیّد سمنانی کے ساتھ گفتگو گزارتے تھے۔

اس زمانے میں وہ روز اپنے گاؤں سے باہر نکل جاتے اور کافی دیر تک تنہائی میں ذکر و اذکار اور مراقبہ میں رہتے۔ وہ اونچی جگہ خود ان کی زندگی میں ہی "فکر ٹینگ" (تفکّر اور مراقبہ کرنے کا ٹیلہ) کہلاتی تھی۔

حضرت شیخؒ اور ان کی والدہ کے درمیان ایک غار میں جو گفتگو ہوئی اس کے متن سے یہ صاف ظاہر ہے کہ موخرالذکر کو اپنے فرزند پر پورا اعتماد تھا اور انھیں امید تھی کہ وہ شیخ (سنز) خاندان کے کھوئے ہوئے مقام کو بحال کریں گے۔

زَرے سے شیخؒ کے تین بچّے ہوئے ــ دو بیٹے اور ایک بیٹی۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی زیادہ دیر زندہ نہیں رہا۔ ایک بیٹا طفولیت میں ہی مر گیا جبکہ بیٹی زون اور دوسرے بیٹے حیدر نے بعد میں غار میں وفات پائی۔

اس خیال کے لیے کوئی بلاواسطہ یا بالواسطہ شہادت نہیں کہ حضرت شیخؒ اپنی زندگی میں حضرت سیّد سمنانی کے علاوہ کسی دوسرے بزرگ یا عالم کے قریب رہے ہوں۔ ہمیں یہ بھی معلوم نہیں آیا کہ لل دید، شیخؒ کی ولادت کے تیسرے روز کے واقعہ کے بعد دوبارہ ان

سے ملی بھی تھیں یا نہیں ۔ ان سے ملنے کئی بڑے ولی ، علماء اور مبلغ آئے، یہاں تک کہ ہندو سنت اور برہمن بھی ان سے ملے ۔ ایک اور مذہبی رہنما حضرت میر محمد ہمدانیؒ بھی حضرت شیخ سے اس وقت ملے جب موخر الذکر کی شہرت عروج پر تھی (اس پر تفصیلی بحث مناسب موقعہ پر ہو گی)۔

ایک دفعہ حضرت شیخؒ کئی روز تک گھر نہیں لوٹے جس سے ان کے گھر والے اور گاؤں والے پریشان ہوئے ۔ انھوں نے پاس کے جنگل میں ان کو تلاش کیا لیکن نہیں ملے ۔ چند روز بعد مویشیوں کی دیکھ ریکھ کرنے والے ایک دیہاتی نے اپنے ریوڑ میں سے ایک مویشی کو غائب پایا اور اس کی تلاش میں وہ ایک گھنے جنگل میں پہنچا، جہاں اس نے ایک بہت ہی گہرا اور تاریک غار دیکھا ۔ اس کے اندر جھانکا تو نُند کو پایا اور گاؤں والوں کو یہ اطلاع دینے کی غرض سے دوڑا دوڑا واپس آیا۔

حضرت شیخ نے غار میں داخل ہونے سے قبل اسے کھُدوایا تھا جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یا تو وہ معاشی طور پر اس قدر آسودہ حال تھے کہ پتھریلی زمین میں گہرا غار کھدوانے کے لیے مزدوروں کی ایک بڑی تعداد کام پر لگائی یا پھر ان کے مریدوں کی اچھی خاصی تعداد تھی جنھوں نے ان کے کہنے پر اس گھنے جنگل میں غار کھودا ۔ حالانکہ ہم جان چکے ہیں کہ انھوں نے گوشہ نشینی سے قبل کافی اثاثہ کمایا تھا لیکن یہ غالباً محض اس دولت کی وجہ سے نہیں تھا کہ غار بہت ہی مختصر وقت میں کھودا گیا بلکہ یہ ان کی شہرت ، اثر و رسوخ اور مقبولیت تھی کہ جس کی بدولت ان کے پیروکاروں نے ان کی خواہش پوری کی ۔

جب ان کی والدہ کو ان کا اتہ پتہ معلوم ہوا تو وہ اس جگہ پہنچیں ۔ ان کے فرزند حضرت شیخ جس ماحول میں رہ رہے تھے وہ اس سے گھبرا گئیں اور شیخ کو گھات میں بیٹھے درندوں اور سانپوں وغیرہ کے خطرے سے آگاہ کیا لیکن حضرت شیخ نے نرمی سے جواب دیا" سانپ اور چوہے تو میرے دوست ہیں"۔ ماں بیٹے کے درمیان خلوت میں طویل گفتگو رہی ۔ یہ گفتگو منظوم صورت میں ہے ۔ اس بات پر شک نہیں کیا جا سکتا کہ ایک ذہین خاتون نے کہ جو عارف شاعر (لل دید) کی صحبت میں رہتی تھیں اور جنھیں حضرت سیّد ہمدانیؒ

اور دوسرے علماء سے تبادلۂ خیال کرنے کا موقعہ ملا تھا، فی البدیہہ شعر کہے ہیں۔ تاہم ان اشعار کی ہئیت اور خیال سے ظاہر ہوتا ہے کہ "گوپھہ بل" (مسکن غار) کے عنوان کی اس طویل نظم میں کافی حد تک الحاقی کلام شامل ہوا ہے۔

بیٹے کو منوا لینے میں جب ماں کی دردناک التجا اور مشفقانہ ترغیب ناکام ہوئی تو وہ مایوس ہوکر گھر لوٹ آئیں۔ پھر انھوں نے اپنی بہو کو اس کے چھوٹے بچّوں کو ساتھ لے کر جانے پر آمادہ کیا تاکہ وہ اپنے شوہر پر اخلاقی دباؤ ڈالنے کی کوشش کرے۔ زَے اپنے بیٹے اور بیٹی کے ساتھ غار تک پہنچی۔ حضرت شیخ نے اُس سے کہا ـ" ان (بچوں) کو اللہ کے حال پر یہیں چھوڑ دو، وہی میرا لائحہ عمل متعیّن کرے گا"۔ بیوی نے بچّوں کو ان کے باپ کی چادر کے نیچے سوتا چھوڑا اور خود گھر لوٹ آئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ (کسی خیال سے) گھبرا گئی۔ غار کی طرف واپس دوڑی اور وہاں بچّوں کو جگانے کی کوشش کی لیکن افسوس کہ وہ مُردہ پڑے تھے۔

یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ بعض لوگوں نے اس واقعہ کا تعلق حضرت شیخ کی فوق الفطری قوّت کے ساتھ جوڑ دیا جبکہ دوسروں نے انھیں جرم کا مرتکب ٹھہرایا۔ چند خودغرض لوگ ان کے سسرال والوں کو مطلع کرنے کے لیے ڈاڈہ سر کے دور دراز گاؤں گئے۔ زَے کے بارسوخ بھائیوں نے حضرت شیخؒ کے خلاف دوہرے قتل کا مقدمہ دائر کیا۔ چنانچہ ان کی گرفتاری کا وارنٹ جاری ہوا اور یہ کام ایک بدنام اور مغرور پولیس افسر تنازی بھٹ کو سونپا گیا۔ تعمیل کنندہ افسر حضرت شیخ کے خلاف بُرا بھلا کہتا ہوا اور ناشائستہ زبان استعمال کرتا ہوا گُپھا کے دہانے تک پہنچا لیکن مضبوط ارادے، انتہائی بہادری اور اپنے بھدّے پن کے باوجود پولیس افسر گُپھا کی طرف دیکھتے ہی تھرتھر کانپنے لگا۔ منکسر المزاج شیخؒ باہر نکل آئے اور پولیس افسر کو تکنے لگے جو اُن کی تاب نہ لاکر چکرانے لگا۔ اُسے ایسا لگا کہ اس کی لمبی مونچھیں خنجروں میں بدل گئی ہیں اور اس کے گالوں کو کاٹ رہی ہیں۔ چنانچہ وہ عارف کے قدموں میں گر گیا۔ اس کے بعد وہ غار میں ان کے ساتھ رہا، زندگی بھر ان کی خدمت کرتا رہا اور آخر کار چرار شریف میں اپنے مرشد کی ایک طرف دفن ہوا۔

یہی وہ زمانہ تھا جب حضرت شیخ کے خلیفہ اوّل اور سب سے بڑے مرید بابا نصرؒ ان سے

آملے۔ کچھ ہی عرصہ میں یہ گپھا تبلیغ کا ایک مرکز بن گئی اور وادی بھر سے لوگ ان سے رشد و ہدایت اور فیض پانے کی خاطر یہاں آنے لگے۔ حضرت شیخ کو جو مقبولیت حاصل ہو رہی تھی وہ ایک جاری رد عمل کا باعث بنی جو ان کے خلاف حسد اور سازشوں پر منتج ہوئی۔ بد نیّت عناصر ولی کو بدنام کرنے کے لیے یکجا ہوئے۔ ایک ایسے شخص کے لیے شاہی عتاب کو دعوت دینے کی سازشیں تیار کی گئیں جو عوام کی بھلائی کے لیے اپنے تذکیہ نفس میں مصروف تھے۔ تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ بادشاہ سلطان سکندر کو ایک بار کوئی شدید بیماری لاحق ہوئی جس کا علاج کرنے میں شاہی طبیب ناکام ہوئے۔ درباری نجومیوں نے بادشاہ کے کان بھر دیے اور حضرت شیخ کو بدنام کرنے اور ایک جھوٹے کیس میں ملوث کرنے کے لیے ایک قصّہ گڑھ لیا۔ ان کا کہنا تھا کہ سلطنت میں کوئی ایسا مکّار ہے جو لوگوں کو دھوکہ دیتا ہے، سیدھے سادے عوام کے ساتھ دغا اور فریب کرتا ہے، ذی عزّت لوگوں کو بدنام کرتا ہے اور اس کے نتیجے میں ملک کے بادشاہ کو ایسی جسمانی بیماری لگ گئی ہے جس کا علاج اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اس مکّار کو ڈھونڈھ نکال کر سزا نہ دی جائے۔

سلطان سکندر کو جب اس طرح کی کہانیاں سنائی گئیں تو اس نے عوام کا استحصال کرنے والے مکّار کو تلاش کرنے کا حکم صادر کیا۔ آناً فاناً اس کے کچھ درباری یہ اطلاع لے کر آئے کہ "انسانی اقدار کے ایک جلّاد نے ولی کے بھیس میں کیموہ گاؤں اور اس کے گرد و نواح میں ظلم روا رکھا ہے"۔ چنانچہ اس پر سلطان نے گرفتاری کا فرمان جاری کیا۔

حضرت شیخ نورالدینؒ کو الہام کے ذریعہ سے یہ سب پہلے ہی معلوم ہو گیا۔ بجائے اس کے کہ انھیں دربار میں ناروا سلوک کے ساتھ لیا جاتا انھوں نے خود کو رضا کارانہ طور پر بادشاہ کے حوالے کیا اور اس سے سزا کی گزارش کی۔ سلطان سکندر پہلی ہی نظر میں ولی کا پیروکار بن گیا۔ اس نے انھیں بڑے احترام کے ساتھ اپنی بغل میں بٹھایا۔ چنانچہ سلطان کی بیماری بھی غائب ہو گئی۔

سات سال سے زیادہ عرصہ کی غار نشینی کے بعد حضرت شیخ اپنے مرید خاص یعنی خلیفہ اوّل کے ہمراہ ملک کی سیّاحت پر جا نکلے۔ کیموہ سے شروع ہونے والی اس طویل سیّاحت

کے پہلے مرحلے میں وہ اسلام آباد (اننت ناگ) گئے جہاں وہ قصبہ میں ایک خاص جگہ پر سجدہ ریز ہونے کی غرض سے ٹھہر گئے۔ مُریداپنے مرشد کی اس حرکت کو دیکھ کر حیران ہوئے اور جب انھوں نے اس بارے میں استفسار کیا تو حضرت شیخ نے جواب دیا: ''یہ جگہ ہمارے لائق و فائق جانشین کی ابدی آرام گاہ ہے''۔ اس پیش گوئی کے لگ بھگ دو سو برس بعد ایک بہت بڑے بزرگ بابا ہردی ریشی اس قصبہ میں ہوگزرے جو وفات پانے پر خاص اسی جگہ دفن ہوئے۔

بُمہ سادھو نام کا ایک ہندو سنت، جو حضرت شیخ کی ولادت کے فوراً بعد کھے گاؤں کے ایک یوگی کے گھر پیدا ہوا تھا، بومزو گاؤں میں رہائش پذیر تھا۔ یہ واضح نہیں کہ آیا اس جگہ کا نام بوم سادھو کے نام پر رکھا گیا تھا یا خود سادھو نے بوم کا لقب اس وجہ سے اختیار کیا تھا کہ وہ اس گاؤں میں رہتا تھا۔ سادھو نے اپنے انتھک گیان دھیان، کشف و کرامات اور اپنے مذہب کے تئیں خلوص اور عقیدے کی بناء پر شہرت پائی تھی۔ روایت ہے کہ اسے ایسی روحانی قوّت حاصل تھی کہ وہ اننت ناگ سے بارہ مولہ تک ستّر میل کے فاصلے پر پھیلے ہوئے تین سو ساٹھ مندروں میں بیک وقت حاضری دیا کرتا تھا اور ان مندروں میں تمام دیوتاؤں کی ایک ہی وقت میں پوجا کیا کرتا تھا۔

سادھو اور شیخ کے درمیان تین روز تک مابعدالطبیعاتی نوعیت کی مفصّل بات چیت رہی۔ ان کے بیچ کیا بات ہوئی اسے نہ کوئی سمجھ سکتا اور نہ ہی اسے قیاس میں لاسکتا، اس لیے اس کی تفصیلات نہیں ملتیں۔ تاہم بعد کے ریشی ناموں اور نور ناموں میں جو مفصّل منظوم مکالمہ شامل ہے اسے ان ہی سے منسوب کیا جاتا ہے۔ یہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے بعض سماجی طور طریقوں کے بارے میں سوالات و جوابات پر مشتمل ہے۔ تاہم یہ باور کرنا مشکل ہے کہ ان دو برگزیدہ روحانی بزرگوں کی بحث و تمحیث کے دوران اس قدر معمولی معاملات حاوی رہے ہوں گے۔

دونوں نے پہلے اپنے اپنے روحانی امتیازات کا مظاہرہ کیا ہوگا۔ آخر کار بُمہ سادھو حضرت شیخ کی فضیلت کو تسلیم کرکے ان کے مریدوں کے حلقہ میں شامل ہوا، مسلمان ہوگیا اور

بام الدین کہلانے لگا اور بومزو کے مقام پر ریشی تنظیم کے پہلے ذیلی مرکز کا سربراہ مقرر ہوا۔
۱۴۱۶ء میں سلطان علی شاہ کے دورِ حکومت میں حضرت شیخ نے اپنی سیاحت کے پہلے مرحلے میں کشمیر کے مختلف پرگنوں میں ریشی مسلک کے مراکز اور ذیلی مراکز قائم کیے اور ان میں سے ہر جگہ خود بھی تھوڑا تھوڑا عرصہ مراقبہ اور تفکّر میں گزارا۔ بومزو کا مختصر دورہ کرنے کے بعد وہ پیر پنچال کے کوہستانی سلسلہ کے دامن میں واقع ایک خوبصورت جگہ، ژمر گئے۔

اب تک ان کے وفادار مریدوں کی اچھی خاصی تعداد بن گئی تھی جن میں بابا تاج الدین (سابق تازی بھٹ) بابا قطب الدین اور بابا نصر شامل تھے۔ بابا قطب الدین سنسکرت کے عالم تھے اور کسی پہنچے ہوئے روحانی مرشد کی جستجو میں وہ کئی سادھوؤں، سنیاسیوں اور ریشیوں سے ملے لیکن ان کی باطنی پیاس کہیں بجھی نہیں تا آنکہ وہ کیموہ کے غارنشین سے ملے جن سے انھیں وہ سب کچھ ملا جس کی انھیں طلب تھی۔ اس سے پہلے ان کا نام کنی پنڈت تھا۔ ان کے مرشد نے ہی ان کا قطب الدین نام رکھا۔ وہ حضرت شیخ کے ذاتی معتمد تھے، مزید برآں وہ ریشی تحریک کے سکریٹری جنرل بھی رہے۔ انھوں نے اپنے مرشد کے اشعار واقوال شاردا رسم خط میں محفوظ کیے۔
اسی زمانے میں سرکاری زبان اور ذریعہ تعلیم سنسکرت کی جگہ فارسی نے لے لی۔ کشمیری زبان کا رسم خط بھی فوری طور پر شاردا سے فارسی میں بدل گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مابعد کے نورناموں اور ریشی ناموں کے مصنّفین شاردا رسم خط سے اپنی ناواقفیت کے باعث اس بنیادی مآخذ کو گرفت میں نہ لا سکے۔ وہ نہ ان کے (قطب الدین کے) تحریر کردہ حضرت شیخ کے اشعار و اقوال کا مطالعہ کر سکے اور نہ ہی ان کی قلمبند کی ہوئی ریشی تحریک کی سرگزشت کا۔
حضرت شیخؒ کے مریدوں — تاج الدین، قطب الدین اور بابا نصر — کا یہ مثلث ان کے ہمراہ ژمر گیا اور وہاں اپنے قیام کے دوران حضرت شیخ کو کشف کے ذریعہ معلوم ہوا کہ ایک اور ہونے والے ریشی ان کی مدد کے منتظر ہیں۔ دشوار گزار خطّے کو پار کرتے ہوئے وہ کشتواڑ کی ایک چھوٹی سی وادی بالمد پہنچے۔ یہاں کے جاگیردار کا اکلوتا بیٹا جے سنگھ سخت

بیمار تھا۔ پریشان حال والدین کو کچھ لوگوں نے بتایا کہ کشمیر کے ایک عارف آپ کے بیٹے کو شفایاب کر سکتے ہیں، لیکن علیل بیٹے کو کیموہ لے جانا ان کے لیے ناممکن تھا۔ دوسرے دن انھوں نے اپنے گھر میں ایک فقیر کو دیکھا جو کوئی اور نہیں بلکہ حضرت شیخ نورالدین تھے۔ شیخؒ نے لڑکے کو ٹھیک کیا اور یہ ہدایت دے کر واپس کشمیر کے لیے روانہ ہوئے کہ پوری طرح صحت یاب ہونے پر لڑکے کو میرے پاس بھیج دیا جائے۔ جے سنگھ فتحیاب ہوا اور اس نے کشمیر جانے پر اصرار کیا لیکن اس کی ماں نے اس کی اجازت نہیں دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ دوبارہ علیل ہوا۔ چنانچہ اسی حالت میں اسے حضرت شیخ کے پاس لایا گیا۔ جے سنگھ مسلمان ہو گیا اور اس کا نام زین الدین رکھا گیا۔ اسے ریشی سلسلے میں شامل کیا گیا اور ایک علاقے کے ذیلی مرکز کا آزادانہ چارج دیا گیا۔ یہ علاقہ اب عیش مقام کہلاتا ہے۔

۱۸-۱۴۱۷ء میں حضرت شیخؒ نے سری نگر کے مضافات میں صورہ کے نزدیک واقع محنتہ پکھری (موتیوں کا چشمہ) کے مقام پر ایک اور ذیلی مرکز قائم کیا جہاں اب شیر کشمیر میڈیکل انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز واقع ہے۔ انھوں نے یہاں مراقبہ میں لگ بھگ ایک سال گزارا۔ اس جگہ کا انتخاب انھوں نے دو وجوہ کی بنا پر کیا تھا۔ ایک اس کے خوبصورت گرد و پیش کی وجہ سے اور دوسرے اس لیے کہ یہاں سے پاس کی سول لائنز میں رہنے والے امراء اور زعماء کے گھروں تک گہرائی کے ساتھ اپنا اثر پھیلانا نسبتاً آسان تھا۔ اس مقام پر دو اہم واقعات رونما ہوئے، پہلا وڈرن کے راجا لودھی رینہ کی تبدیلی مذہب کا اور دوسرا یادن مژ کا واقعہ۔

ایک صبح جب حضرت شیخ اپنے جھونپڑے میں مراقبہ میں محو تھے، باہر کے سبزہ زار چہکتے پرندوں کی میٹھی آواز سے معمور تھے، آرکسٹرا کی دھن نے ماحول کی کشش کو دوبالا کیا۔ اس نغمہ زار گرد و پیش کے منظر میں ایک سریلی نسوانی آواز ابھری تو ماحول کیف آور بن گیا۔ ایک نرتکی آرکسٹرا کی دھن پر گاتے ہوئے رقص کر رہی تھی۔ اس شور سے حضرت شیخؒ کے مراقبہ میں خلل پڑا۔ وہ باہر آئے اور رقاصہ یادن مژ (مخمور جوانی) کو نصیحت کی کہ جس نے عشوہ طراز تبسّم میں جواب دیا۔ شیخ کو بہت غصّہ آیا اور نرتکی کے ساتھی خوفزدہ ہو کر بھاگ گئے

لگے۔ پاون مڑ اپنے ساتھی سنگت کی حالت دیکھ کر حیران ہوئی اور انھیں روکنے کے لیے چلّائی لیکن اس کے ساتھی اور تیز بھاگنے لگے۔ نرتکی پھر ان کے پیچھے ہولی حضرت شیخ کے جھونپڑے سے تھوڑے ہی فاصلے پر نرتکی کا سنگار کرنے والی نے اسے آئینہ دکھایا۔ اس نے آئینے میں اپنا چہرہ بگڑا ہوا پایا اور رنج و یاس سے اس کے حلق سے ایک چیخ نکلی۔ جوان، حسین اور دلکش عورت ایک بدصورت بوڑھی چڑیل میں تبدیلی ہوگئی تھی۔ چنانچہ وہ اپنی غلطی پر شرمندہ ہو کر ولی کے قدموں میں جا گری اور وعدہ کیا کہ میں ایک پاکیزہ زندگی بسر کروں گی۔

حضرت شیخ نے ایک خیال انگیز نظم تخلیق کی ہے جس میں اس واقعہ کے تعلق سے اپنا تجربہ پیش کیا ہے۔ یہ نظم استعاراتی، علامتی اور متصوفانہ ہے۔ مذکورہ واقعہ کے بعد نرتکی حضرت شیخ کی وفادار مرید رہی۔ اس کی خواہش کے مطابق اسے حضرت شیخ کے آستانِ عالیہ کے صدر دروازے کے ٹھیک سامنے دفن کیا گیا۔ جو بھی زائر آستان میں فاتحہ خوانی کے لیے داخل ہوتا ہے اسے اس کی قبر کے اوپر سے چلنا پڑتا ہے۔ حضرت شیخ کی خواتین مریدوں میں سے وہ اپنے اصل نام یعنی شانگہ بی بی کے نام سے ہی جانی جاتی ہے۔

اس کے بعد حضرت شیخ دربہ گام گئے جو اب بڈگام ضلع میں شامل ہے۔ یہ گاؤں اور اس کے گرد و نواح کا علاقہ ایک امیر کسان سنگی گنائی کی ملکیت تھا۔ اس نے اپنا مکان اور زمین کا کچھ رقبہ حضرت شیخؒ کو پیش کیا۔ حضرت شیخ یہاں کافی عرصہ رہے اور بعدازاں اپنا صدر مقام کیموہ سے یہاں منتقل کیا۔ یہ مسلّمہ ہے کہ آٹھ سو سے بارہ سو کی تعداد میں کشمیری برہمنوں کی ایک جماعت تلی رام نامی ایک عالم اور سادھو کی قیادت میں اس جگہ حضرت شیخ سے ملاقی ہوئی جس نے ان پر مذہب، روحانیت، مابعد الطبیعات، حیات بعد ممات اور خدا کے وجود سے متعلق سوالات کی بوچھاڑ کی۔ حضرت شیخ نے بڑی نرمی اور انکساری کے ساتھ انھیں مطمئن کیا اور ان کا جارحانہ انداز ٹھنڈا پڑ گیا۔ بالآخر یہ ہندو ان کے ریشی سلسلے میں داخل ہو گئے۔ شیخ نے ان میں سے ہر شخص کو ایک ایک گاؤں یا پرگنے کا نمائندہ مقرر کیا تاکہ وہ پیغام حق کی اشاعت کریں، ضرورت مندوں اور جسمانی طور پر کمزور لوگوں

کی مدد کریں، راستوں اور شاہراہوں میں سایہ دار اور ثمر دار پیڑ لگائیں، پیاسوں کو پانی پلائیں، چھوٹے چھوٹے راستے بنائیں، نہروں اور تالابوں کی مرمّت کریں اور یوں انسانیت کی خدمت انجام لائیں۔

دربہ گام سے حضرت شیخ نورالدینؒ عارضی طور پر بارہ مولہ ضلع کے دُور دراز علاقہ گرہن لڈی جنگل منتقل ہوئے۔ یہاں بھی انھوں نے ریشی تحریک کا ایک ذیلی مرکز قائم کیا۔ اس عرصہ کے دوران انھوں نے بعض دوسرے مقامات پر غاروں، جھونپڑوں اور کھلی جگہوں پر بھی قیام کیا لیکن یہ قیام بہت مختصر تھا۔ لوگوں نے ان کی وفات کے بعد ہر اس جگہ یادگاریں کھڑی کردیں جہاں حضرت شیخؒ نے دھوپ سینکی تھی، سر منڈھوایا تھا یا پھر لمحہ بھر کے لیے ستایا تھا۔ اس طرح کشمیر میں کم و بیش ہر دوسرے گاؤں میں ایک آستان ہے جو حضرت شیخؒ یا ان کے مریدوں یا جانشینوں کے دورے کی یاد کو محفوظ رکھے ہوئے ہے۔

وادی بھر کے اپنے دوسرے دورے کے دوران حضرت شیخؒ نے ہر پرگنے میں کسی نہ کسی جاذبِ نظر جگہ پر قیام کیا۔ اُن دنوں وادی چھتیس[۳۶] پرگنوں میں منقسم تھی۔

اپنے تیسرے دورے میں وہ گاؤں گاؤں گھومے اور کہا جاتا ہے کہ وہ اس قدر کمزور اور ناتواں ہو چکے تھے کہ چلنے سے بھی معذور تھے۔ ان کے عزیز ترین ساتھی بابا نصرؒ نے بید کا ٹوکرا تیار کیا تھا جس میں وہ حضرت شیخ کو بٹھا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتے تھے۔ شیخ جہاں بھی انھیں ٹھہرنے کے لیے کہتے بابا نصر ٹھہر جاتے اور شیخ لوگوں سے ملنے کے لیے نیچے اُتر جاتے۔

زندگی کے آخری دنوں میں حضرت شیخ نورالدین نے اپنی تحریک کا صدر دفتر مستقل طور پر چرار شریف منتقل کیا تھا۔ جو اس وقت ایک گھنا جنگل تھا۔ وفات کے بعد وہ اُسی جگہ آسودۂ خاک ہوئے جو دیکھتے ہی دیکھتے ایک قصبے کی صورت اختیار کر گئی۔ یہ قصبہ اس وقت چرار شریف کہلاتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اس جنگل میں پھلوں کا ایک باغ تھا جو زمیندار سنگرام ڈار کی ملکیت تھا۔ سنگرام ڈار حضرت شیخ کا مرید بن گیا اور انھیں یہ باغ تحفے کے طور پر پیش کیا حضرت شیخ

نے اپنی زندگی میں ریشیوں کے لیے بنیادی تربیتی مرکز چرار میں ہی قائم کیا۔ انھوں نے خود ایک مسجد بھی بنوائی جسے بعد میں پھیلا کر خانقاہ کی صورت دے دی گئی۔

دریہ گام سے چرار جاتے ہوئے حضرت شیخ العالم نے دو اور مقامات ـــ روپہ ون اور راہکے ـــ پر قیام کیا۔ روایت ہے کہ روپہ ون کے مقام پر تین سو سے زیادہ مسلمان علمائے دین اس ضعیف شخص کی قیام گاہ پر لوٹ پڑے اور دینیات اور دیگر اہم معاملات پر پیچیدہ سوالوں سے پریشان کرنے کی کوشش کی۔ حضرت شیخ نے اپنے اشعار میں مُلّاؤں اور برہمنوں، دونوں کا پول کھول دیا تھا جس کے رد عمل میں انھوں نے شیخ کو اَن پڑھ، مکّار، قصاب اور کفر پھیلانے والا قرار دیا تھا۔ وہ انھیں بے نقاب کرنا چاہتے تھے لیکن بدلے میں حضرت شیخ نے اصول اسلام سے متعلق ایک سو تیس معاملات کی منظوم توضیحات پیش کیں۔ یہ نظم جو تحریری صورت میں محفوظ ہے ان کی دینی سمجھ، ریاضی کی فہمائش اور جغرافیہ پر ان کی گرفت کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔ چنانچہ ان سارے مُلّاؤں نے آپ کی برتری تسلیم کی اور آپؒ کی امامت میں مغرب کی نماز میں شامل ہو گئے۔ ان میں سے شریف اشور اور مُلّا پیر بابا، حضرت شیخ کے مرید بن گئے۔ روایت ہے کہ یہ تمام علماء ایک ایسے جھونپڑے میں سما گئے جس میں عام حالات میں صرف دو افراد کے لیے جگہ تھی۔

اپنے دورے کے دوران میں حضرت شیخ نورالدّین نے کچھ علاقوں، وہاں کے لوگوں اور ماحول اور بعض خطّوں کے محل وقوع کے بارے میں اپنے مشاہدات و تاثرات بیان کیے ہیں۔ منظوم صورت میں اس طرح کے مشاہدات اور تبصرے متعلقہ خطّوں اور علاقوں کی بود و باش کی صحیح تصویر پیش کرتے ہیں۔

حضرت شیخؒ کے آخری ایّام کے بیان سے قبل مناسب ہے کہ ان کے اساتذہ اور مرشدوں کے بارے میں بحث کی جائے۔ تذکرہ نویسوں، سوانح نگاروں اور مورّخوں نے اس اہم موضوع کو بگاڑ دیا ہے۔ کسی روحانی پیشوا کو دوسرے روحانی بزرگ کا شاگرد قرار دینا نہ تو موخرالذکر کی فضیلت کا مظاہرہ کرتا ہے اور نہ ہی اوّل الذکر کے درجہ کو کم کرتا ہے۔ بدقسمتی سے اس نازک معاملہ پر بحث کرتے ہوئے لوگوں نے انتہاپسندی کا مظاہرہ کیا

ہے۔ایک طرف شیخ العالمؒ کو کسی نہ کسی بزرگ کا مرید ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور دوسری طرف انھیں ایسے تکلفات سے بالاتر قرار دیا گیا ہے۔یہ ایک جانی مانی حقیقت ہے کہ حضرت شیخ پیدائشی ولی تھے لیکن اس کے باوجود ان کی گہری صلاحیتوں کو نمایاں کرنے کی ضرورت ہے۔

صوفی مسلک میں رشد وہدایت کے دو پہلو ہیں۔مرشد ایک استاد کی طرح طالب کے لیے بعض معمات کو حل کرتا ہے یا پھر اپنے صوفیانہ تجربات میں طالب کو جن پیچیدگیوں کا سامنا ہوتا ہے انھیں سلجھانے میں اس کی مدد کرتا ہے۔روحانی تربیت کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ مرشد جس خاص صوفی سلسلے سے تعلق رکھتا ہو اس کے مخصوص حلقہ میں شاگرد کو داخل کیا جائے اور اس سلسلے کا سربراہ یا رُکن بنایا جائے۔

زندگی کے کئی مرحلوں پر حضرت شیخؒ کو رہبری کی ضرورت پڑی جو انھوں نے چند صوفی رہنماؤں سے حاصل کی لیکن وہ (ان کے) کسی خاص صوفی سلسلے میں داخل نہیں ہوئے۔ اس ضمن میں سب سے پہلے للہ عارفہ کا نام آتا ہے جنھوں نے نوزائیدہ شیخ کو اوّلین غذا کے طور پر عشق کا لطف فراہم کیا۔اگرچہ حضرت شیخ کو ان کی مشفقانہ عارفانہ کاملیت سے مستفیض قرار دیا جا سکتا ہے تاہم ان کا مرید نہیں کہا جا سکتا۔لل دید کی عظمت کا انھوں نے اس شعر میں اعتراف کیا ہے۔؎

تس پدمان پورِ چہ للے   تمہِ امرت چوگلہِ گلہِ
تس سانہِ اوتار لولے   تیتھ مِہ وردِتو دِوو

جس نے گھونٹ گھونٹ امرت پی لیا   پدمان پور کی للہ (عارفہ)
میرے اللہ! مجھے بھی ایسی ہی توفیق دے   جس نے اوتاروں کو گودی کھلایا

لل دید کے اوصاف بیان کرتے ہوئے شاعر کہتے ہیں کہ وہ لافانی ہو گئی ہیں اور انھوں نے اوتاروں کو گودی کھلایا ہے۔روایت ہے کہ شاعرہ للہ عارفہ کی گود کو ایک ہی ولی نے زینت

بخشی اور وہ خود حضرت شیخ نورالدین تھے۔ غرض اس شعر میں شاعر ایک طرف لل دید کی مدح سرائی کرتے ہیں اور دوسری طرف بالواسطہ طور پر خود کو ریشی کی حیثیت سے ظاہر کرتے ہیں، جیساکہ شعر سے مترشح ہوتا ہے ان دو کے درمیان ماں اور بیٹے کا رشتہ ہے نہ کہ شیش اور گرو (مرید و مرشد) کا۔

دوسری اہم روحانی شخصیت، جس سے حضرت شیخ اوائل عمر ہی سے قریب تھے (اور جس سے ان کے گھر والوں کے بھی گہرے تعلقات تھے) حضرت سید حسین سمنانی[۲] کی تھی۔ اس بزرگ کی تعریف کرتے ہوئے حضرت شیخ کہتے ہیں کہ یہ ان کے والد سالار سنز کے رہبر اور مرشد تھے۔ اگر حضرت شیخ نے حضرت سمنانی سے کوئی صوفیانہ رہبری حاصل کی ہوتی تو انھوں نے نسبتاً زیادہ زور دے کر ایسا کہا ہوتا۔ حضرت شیخ کے سولھویں صدی عیسوی کے سوانح نگار حضرت بابا نصیب غازی[۳] مذکورہ دو شخصیات کے باہمی تعلقات بیان کرتے ہوئے ان تعلقات کو آپسی محبّت اور قدردانی کی حدود کے اندر ہی رکھتے ہیں۔ حضرت سمنانی، حضرت شیخ العالم کی شخصیت اور شاعری دونوں کے دلدادہ اور شیدائی تھے، پس ان کے درمیان پیر و مرید کا کوئی رشتہ نہیں تھا۔

روایت کے مطابق تیسری شخصیت، کہ جس سے حضرت شیخ ملے، حضرت میر سید ہمدانی[۲] کی تھی۔ کشمیر پر حضرت امیر کی بھرپور روحانی توجہ شیخ العالم کی رہبری کرنے کی خواہش کے ہی طفیل تھی۔ موخرالذکر اس وقت صرف چھ سال کے تھے جب حضرت امیر آخری بار کشمیر آئے۔ اگرچہ روایت ہے کہ حضرت امیر کبیر[۲] اس ابھرتے ہوئے ولی سے ملنے کیموہ گئے اور ان کی تربیت کا کام حضرت سید سمنانی اور لل دید کے سپرد کیا لیکن بعض حقائق اس مضبوط روایت کے استناد کو جھٹلاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت امیر[۲] کے بارے میں ہمعصر تحریروں یا بعد کے رسالہ جات میں یہ واقعہ درج نہیں ہے۔ بعض معاملات ایسے ہیں جنھیں ایسی تحریروں کا جائزہ لینے سے قبل ذہن میں رکھنا لازمی ہے۔

یہ بات کئی بار کہی جا چکی ہے کہ ہمعصر سنسکرت وقائع جات میں لل عارفہ اور حضرت شیخ نورالدین کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ ایسی فروگذاشتوں سے یہ مراد نہیں کہ ہماری تاریخ کے ان دو بڑے

ستونوں کے وجود ہی سے انکار کیا جائے۔ اسی طرح ان وقائع جات میں حضرت امیر کبیرؒ کی آمد کی تفصیل بھی نہیں ہے۔ جہاں تک حضرت شیخ کے بارے میں لکھی گئی بعد کی تاریخوں اور سوانح عمریوں کا تعلق ہے یہ بات بلا خوفِ تردید کہی جاسکتی ہے کہ ان تحریروں کے پیچھے ایک خاص کمپلکس کارفرما تھا۔ اگر ملاّ احمد کی "تاریخ کشمیر" یا حضرت شیخ کے کلام کی تفسیر کا سُراغ لگایا جاسکے۔ یا بابا احمد کے تذکرہ مشائخ کا پتہ لگایا جاسکے تو اس معمّہ کو حل کیا جاسکتا ہے۔ پس اگر مابعد کی تاریخیں یا دوسری سوانحی دستاویزات حضرت شیخ نورالدینؒ یا ان کے مریدوں سے تعلق رکھنے والے کچھ اہم واقعات سے فروگذاشت کرتی ہیں تو اس سے ان حقائق سے انکار کی بنیاد فراہم نہیں ہوتی جن کی جڑیں روایت میں گہرے طور پر پیوست ہیں۔ یہ امر واقعہ ہے کہ بدخشی[۱]، حضرت امیر کبیرؒ کے مرید تھے اور اپنے مرشد کے بارے میں ان کا بیان مستند ہی ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ عجب بات ہے کہ انھوں نے کشمیر میں حضرت امیرؒ کی سرگرمیوں کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ نتیجہ کے طور پر یہ ماخذ ہمارے لیے غیر متعلق ہے۔ جہاں تک "فتوحاتِ کبرویہ" کا تعلق ہے، یہ حضرت امیر کبیرؒ کی وفات کے تقریباً چار سو سال بعد کی تصنیف ہے۔ اس لحاظ سے اس طویل مدّت کے بعد مصنّف کو چھوٹی چھوٹی تفصیلات دستیاب نہیں رہی ہوں گی۔ یہاں بھی خود کلامِ شیخ سے جواب تلاش کرنا پڑتا ہے جو نہ صرف ان کے بارے میں حقائق کی جانکاری کے لیے بلکہ ان کے عہد کو جاننے کے لیے بھی بہت بڑا ماخذ ہے۔ ایک شعر میں وہ کہتے ہیں ؎

نندہ ریشی نے شاہِ ہمدانؒ سے گزارش کی
جنّت کو مجھے اپنے ہمراہ لے جایئے گا

یہ جاننا لازمی ہے کہ آیا یہ مصرعے شاعر نے محض حضرت امیر (شاہِ ہمدان) کی روحانی عظمت کی تعریف میں لکھے ہیں یا پھر ان کا ماحصل محض وہ خواہش ہے جسے ایک طالبِ وجد کی حالت

---

[۱] سید نورالدین بدخشی (متوفی ۷۹۷ھ) حضرت امیرؒ کے مرید تھے۔ انھوں نے "خلاصۃ المناقب" لکھی جو ان کے مرشد کے کارناموں کو پیش کرتی ہے۔

ظاہر کرتا ہے ۔ شاعر نے ان مصرعوں میں صیغہ ماضی استعمال کیا ہے ۔ یہ مصرعے اگر محض شاہ ہمدان کی مدح میں ہوتے تو وہ اس طرح کہتے کہ " شاہ ہمدان نے نندریشی کو وعدۂ بہشت سے سرفراز کیا " یا یہ کہ " شاہ ہمدان، نندریشی کو اپنے ہمراہ بہشت میں لے جائیں گے، یا پھر یہ کہتے کہ " نند، حشر کے روز شاہِ ہمدان سے گزارش کریں گے کہ خود اپنی ہمراہی میں مجھے جنت لے جائیے "۔ اس کے برعکس ان مصرعوں کی زبان راست مفہوم کی ترسیل کرتی ہے ۔ ان مصرعوں سے ایک ہی تاثر پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ حضرت شیخ نے خود ہی (ایک ملاقات کے دوران) حضرت شاہِ ہمدان سے گزارش کی کہ " مجھے اپنے ساتھ جنت لے جائیے "۔ یہ بھی صاف ظاہر ہے کہ ان مصرعوں کی تہ میں جو خیال ہے وہ کم سِن نورالدّین کا ہے نہ کہ پہنچے ہوئے ولی کا ۔ بعد کے ایک اشلوک میں شاعر نے کہا ہے ؎

جنت کی ہوس میں اور دوزخ کے خوف سے
اے اللہ! لوگ تیری عبادت کرتے ہیں

ایک ایسے ولی جو جنت کے آرام و سکون کو معمولی ذاتی ہوس خیال کرتے تھے، اپنے بزرگ تر ولی سے اس طرح کی معمولی درخواست نہ کرتے اگر انھوں نے بڑی عمر میں حضرت امیرؒ کی تعریف میں یہ شعر کہا ہوتا ۔ اس طرح یہ ظاہر ہے کہ محولہ بالا شعر میں شیخ العالم نے کم سِنی میں ایک پہنچے ہوئے روحانی پیشوا سے اپنی ملاقات کا خلاصہ بیان کیا ہے ۔

استعاراتی معنوں میں اپنے ہمراہ جنت لے جانے سے مراد ہے طالب کو روحانی کمالات کی طرف رہبری کرنا ۔ ظاہر ہے کہ یہ گزارش اوّل تو بلا واسطہ تھی، دوم حضرت شیخ نے اپنی زندگی کے اُبھرتے ہوئے روحانی مرحلے میں کی تھی اور سوم، یہ حضرت امیر کبیر کے صوفی سلسلے میں داخلے کی غرض سے کی گئی تھی ۔ حضرت شیخ کی خاتون مرید شام بی بی نے اپنے مرشد کی وفات پر جو مرثیہ کہا ہے اس میں وہ کہتی ہیں ؎

اے حضرت امیر کے شاگرد
آپ نے اپنے عالمانہ خطبوں میں
اپنی زیرکی اور ذہانت سے
عالموں اور دینی ماہروں کو شرمندہ کیا ۔

شام بی بی نے لفظ "ژاٹھ" استعمال کیا ہے جس کے معنی 'شاگرد' کے ہیں۔ انھوں نے "نہ شیش" کہا ہے اور نہ 'مرید' جو کہ تصوف میں اس قسم کے تعلقات کے لیے مستعمل الفاظ ہیں۔

پس اس بات کے ثبوت کے لیے تسلّی بخش اندرونی شواہد ملتی ہیں کہ ان دو کی ملاقات ہوئی تھی اور کم سن شیخ نے حضرت امیر کی رہبری کی خواہش کی تھی۔ چھ سال کے بچّے کو صوفی سلسلہ میں داخل کرنا عملی طور پر مشکل تھا۔ چنانچہ حضرت امیر نے حضرت شیخ کو سید سمنانی کی تربیت میں دے دیا۔

آخر پر یہ کہ حضرت شیخ نورالدین کے بارے میں مابعد کی تاریخوں اور سوانح عمریوں' دونوں میں اس بات کی شہادت ملتی ہے کہ حضرت امیر کبیرؒ کے فرزند ارجمند حضرت سید محمد ہمدانیؒ' شیخ نورالدّین سے ایک سے زائد بار ملے۔

کہا جاتا ہے کہ ممتاز غیر ملکی مبلّغین اور علماء کے ایک وفد کی قیادت کرتے ہوئے حضرت سید محمدؒ چرار شریف گئے جہاں ان دنوں حضرت شیخ قیام پذیر تھے۔ شیخ کو ان کی آمد کی خبر ملی اور وہ استقبال کو آگے آئے۔ فریقین کی یہ ملاقات زالُس (جو اب سری نگر سے چرار شریف کے راستے پر چھبیس کلومیٹر کی دوری پہ واقع چھوٹا سا گاؤں ہے) کے مقام پر ہوئی۔

روایت ہے کہ حضرت سید محمد ہمدانی کے بعض ساتھی ایک "ان پڑھ، سادہ اور بھولے بھالے شخص" کے ساتھ اپنے قائد کی ملاقات پر معترض تھے۔ انھوں نے حضرت شیخ کے بارے میں کئی طرح کی غلط فہمیوں کو راہ دی۔ ان میں سے حضرت سید محمد کا موذّن سید غلام الدّین مغرب کی اذان دینے کے لیے کھڑا ہوا۔ شیخ نے اسے ایسا کرنے سے منع کیا کیونکہ ابھی اذان کا وقت نہیں ہوا تھا۔ غلام الدّین نے شیخ کے حکم کی تعمیل میں پس و پیش کیا لیکن اس کے قائد نے اسے تنبیہہ کی۔ پھر حضرت شیخ نے غلام الدّین کو اپنے پاس بلایا اور اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ تب غلام الدّین کو اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ کالے بادلوں کی وجہ سے اسے گردو پیش تاریک

ے "ژاٹہ کوٗر" کا استعمال خواتین مریدوں کے لیے مخصوص ہے جبکہ مرد مریدوں کو یا تو خلیفہ کہا جاتا ہے یا مرید۔

دکھائی دے رہا تھا جبکہ سورج ابھی غروب نہیں ہوا تھا۔ اس واقعہ نے غلام الدّین کی سوچ میں تبدیلی لائی اور وہ حضرت شیخؒ کا خدمت گزار بن گیا۔ وفات کے بعد اسے سری نگر کے مضافات میں دفن کیا گیا جہاں مشہور مغل باغات واقع ہیں۔

حضرت شیخ نورالدینؒ نے حضرت میر محمد سیّدؒ کے سوالات کا بڑی حلیمی سے جواب دیا۔ ان کی بے انتہا منکسر المزاجی نے خود ان کے ساتھیوں میں ایک ردّعمل پیدا کیا اور ان کی دو خاتون مریدوں، دوہت دیدا اور بہت دیدنے بھی مناظرہ اور مباحثہ میں حصہ لیا۔ حضرت میر محمد ان دو خواتین کے پختہ اور خیال انگیز بیانات سے بہت متاثر ہوئے۔ اس ملاقات کا اختتام فریقین کے ایک دوسرے کے استحسان پر ہوا۔ حضرت شیخ کے سوانح نگاروں نے ملاقات کے اختتام کے بارے میں ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ " دونوں ایک دوسرے سے مستفیض ہوئے "۔

حال ہی میں" خط ارشاد" کے نام سے ایک دستاویز کی نشاندہی ہوئی ہے جس پر حضرت میر محمد ہمدانیؒ کے دستخط ہیں اور جس کی تصدیق سلطان سکندر نے کی ہے۔ اس پر ۱۴۰۸ء کی تاریخ درج ہے۔ ایک مکتبہ فکر کے مطابق یہ دستاویز تصوّف کے کبروی سلسلہ میں حضرت شیخ کو شامل کرنے کے لیے' خطِ ارشاد' ہے۔ اس سلسلے کی قیادت اس وقت حضرت میر محمد کرتے تھے۔ دوسری طرف علماء کی ایک اچھی تعداد کے خیال میں اس دستاویز کا استناد مشکوک ہے۔ دونوں کے یہاں منفی اور مثبت پہلو ملتے ہیں اور ان میں سے کسی ایک رائے کو قبول یا ردّ کرنا ایک مفصّل اور طویل بحث کا متقاضی ہے۔ تاہم اس دستاویز کے بارے میں بعض باتوں کی مختصراً نشاندہی کرنا ضروری ہے۔

مذکورہ دستاویز کے احقاقِ حق کو اس قدر معمولی خیال نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہ اس شہرت، عظمت اور مقبولیت کے بارے میں واحد عصری شہادت ہے جو حضرت شیخؒ کو اپنی حیات کے دوران حاصل رہی۔ یہ امر حضرت شیخ کی ہمہ جہت شخصیت میں ایک اور جہت کا اضافہ کرتا ہے کہ ایک بادشاہ نے اپنی مہر اور دستخط سے اس دستاویز کی تصدیق کی ہے۔ یہ دستاویز ہرن کی کھال پر عربی رسم خط میں ہے اور خانقاہِ معلیٰ سری نگر میں ایک تبرّک

کے طور پر محفوظ ہے۔

اس سلسلے میں جو شبہات ظاہر کیے گئے ہیں ان کی بنیاد بھی مضبوط اور ٹھوس منطق پر ہے۔ میر محمدؒ کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ وہ ۱۳۹۳ء میں وارد کشمیر ہوئے اور یہاں بارہ سال قیام کیا۔ یوں بھی ان کی واپسی کا سال ۱۴۰۵ء تھا۔ حاجی محی الدّین نے کہا ہے کہ میر (محمد ہمدانی) کشمیر میں بائیس سال رہے۔ انھوں نے چونکہ اپنے بیان کے حق میں کسی سابق ماخذ کا حوالہ نہیں دیا ہے اس لیے واحد ان کی رائے کسی سابق تحریر کی تردید نہیں کر سکتی۔ حاجی موصوف نے اپنی کتاب رواں صدی کے اوائل میں لکھی اور اس میں جو واقعات بیان کیے ہیں وہ پہلے ہی ماقبل کی تاریخی تحریروں میں شامل ہے۔ موصوف نے صرف اسی واقعہ کے تعلق سے اختلاف رائے کا اظہار کیا ہے اور اس کی وجہ نہیں بتائی ہے۔ ایک فارسی وقائع جو حضرت میر کی وفات کے سو سال بعد لکھی گئی، کا مصنّف سید علی لکھتا ہے کہ میرؒ کا کشمیر میں صرف بارہ سال قیام رہا۔ حال ہی میں ڈاکٹر ریاض نے بھی اپنی اردو تصنیف "میر سیّد حمدانی" میں میر محمدؒ کی کشمیر کی آمد کا سال ۷۹۶ ہجری اور یہاں سے روانگی کا سال ۸۱۷ ہجری درج کیا ہے۔ موصوف نے کم و بیش حاجی محی الدین کا تتبع کیا ہے لیکن ماقبل کے کسی ماخذ کا حوالہ نہیں دیا ہے۔ اس طرح میر محمد کے قیام کے بارے میں اوّلین نظریے کو ماننے والا طبقہ مذکورہ دستاویز (خط ارشاد) کے وجود کو ہی معرضِ سوال میں لاتا ہے جب کہ دوسرے مکتبہ فکر کے پیروکار اس دستاویز کو حضرت شیخ کے بارے میں مستند معاصر تحریر خیال کرتے ہیں۔ تاہم اس دستاویز کو جس طرح سے "خط ارشاد" کا نام دیا گیا وہ غلط ہے۔ اس کا کوئی عنوان نہیں ہے اس لیے خود اس کے متن سے کوئی موزوں عنوان اخذ کیا جا سکتا ہے۔ یہ مسلّمہ حقیقت ہے کہ کسی تحریر کا عنوان خود اس کی عبارت سے متعین اور حاصل کیا جا سکتا ہے۔ مذکورہ تحریر کو کوئی عنوان دینے سے قبل مندرجہ ذیل حقائق کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے:

۱۔ عبارت میں اس کا ذکر نہیں کہ طالب (شیخؒ) نے میرؒ کے صوفی سلسلہ میں داخلے کی اجازت چاہی تھی۔

۲۔ یہ (دستاویز) حضرت شیخؒ کو باقاعدہ طور پر کسی صوفی سلسلہ میں شامل نہیں کرتی۔
۳۔ یہ صرف حضرت شیخؒ کی روحانی عظمت کو تسلیم کرتی ہے اور اس میں یہ فتویٰ شامل ہے کہ ان کی ربشبیت جائز ہے۔

اس دستاویز کی عبارت ایسی ہے کہ یہ حضرت میرؒ کے تسلیم کردہ شیخ کے روحانی انفراد کا معتبر فیصلہ معلوم ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں اس کے مضامین سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے عطا کنندہ کو کسی نزاع کو دور کرنے کی بڑی شدید اور مخلصانہ خواہش تھی۔ یہ واضح طور پر ایک فتویٰ بھی معلوم ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ مخصوص عبارت کسی ایسے پس منظر پر دلالت کرتی ہے جس میں یہ ضرورت آ پڑی تھی کہ حضرت شیخؒ کے روحانی انفراد کا تحریری طور پر اعتراف کیا جائے۔ ساتھ ہی کسی تنازعہ کو دُور کرنے اور حضرت شیخ کے طریق کار سے کسی قسم کے اختلاف کے وجود کو ختم کرنے کی بھی ضرورت تھی۔ اس پسِ منظر کی چھان بین تحقیق کے لیے ایک الگ موضوع ہے۔ تاہم بعض معقول سوالات ضرور اُبھرتے ہیں اور ان کا ایک عمومی جائزہ کم از کم اس موضوع کے ساتھ کچھ انصاف کر سکتا ہے۔

آخر ایسا فتویٰ کیوں؟ کیا وجہ ہے کہ میرؒ فتویٰ قسم کی رائے دینے پر مجبور ہوئے؟ اس تحریر کی تصدیق بادشاہ سے کیوں کرائی گئی اور حضرت میرؒ کے صوفی سلسلے سے تعلق رکھنے والے کسی روحانی بزرگ سے نہیں؟ جیسا کہ خلافت نامہ[۱] کے اجزا کے وقت ہوتا ہے۔

ان سوالات کے جواب کے لیے پس منظر کا حوالہ انتہائی ضروری ہے۔

اس سے پہلے ہم جان چکے ہیں کہ حضرت میر محمد ہمدانیؒ کے کئی ساتھیوں کو شیخ العالمؒ کے روحانی تفوّق اور انفراد کے بارے میں شبہ تھا۔ ان کے عجز و انکسار کو ناخواندگی کا نام دیا گیا اور مذہبی قیادت کو کسی ناخواندہ کے ہاتھوں میں رہنے دینا خطرناک سمجھا گیا۔ غیر ملکی علماء اور سادات دنیاوی منصبوں کے شوقین تھے۔ انھیں اپنی علمی اور نسلی

---

[۱] خلافت نامہ وہ خط ہے جس کے ذریعہ سے صوفی سلسلہ میں باقاعدہ طور پر داخلہ ملتا ہے اور شاگرد یا مرید کو اس خاص مسلک کو فروغ دینے کا اختیار ملتا ہے۔

برتری اور اپنے تمدن پر ناز تھا۔ دوسری طرف ریشی حلقوں میں برتری کے اس میلان کے خلاف ردّعمل پایا جاتا تھا جو اس واقعہ سے ظاہر ہے کہ جب شیخ العالمؒ نے حضرت میرؒ کے کے ساتھ اپنی ملاقات میں عاجزی اور حلیمی کے ساتھ برتاؤ کیا تو اوّل الذکر کی دو خاتون مریدوں نے مدافعت کی۔ ایسا اس بات سے بھی ظاہر ہے کہ میرؒ کا ایک ساتھی سید غلام الدّین اس ملاقات کے دوران حضرت شیخؒ کی ہدایت کے مطابق اذان دینے سے ہچکچایا۔

حضرت شیخ العالمؒ نے ترک لحم، سادگی اور تفکّر و مراقبہ کی مقامی روایت سے منسلک روحانی طریقِ کار کے ذریعہ سے غیر مسلم آبادی کو بھی متاثر کیا۔ انھوں نے اپنا پیغام پہنچانے کے لیے مقامی زبان کو ایک طاقتور ذریعہ کے طور پر استعمال کیا اور ان کا اثر عوام میں گہرائی تک سرایت کر گیا۔ حضرت میر محمدؒ اور حضرت شیخ نورالدینؒ کے مقاصد پوری طرح یکساں تھے لیکن اُن غیر ملکیوں کو، جو اپنے کھوئے ہوئے وقار اور مرتبے کو پھر سے حاصل کرنے کے لیے کشمیر آئے تھے، حضرت شیخؒ کی مقبولیت کے باعث اپنے تئیں خطرہ محسوس ہوا۔ اونچی ذات کے برہمنوں اور اِن غیر ملکی عناصر کے مفادات یکساں نوعیت کے تھے اور اوّل الذکر نے بھی محسوس کیا تھا کہ وہ شیخؒ کے ابھرتے ہوئے مسلک سے مرعوب ہو رہے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں نے باہم مل کر شیخؒ کو "اَن پڑھ مکّار" کا نام دیا۔ دوسری طرف خود حضرت شیخؒ نے ان دونوں پر طنز کیا۔ مقامی اور غیر ملکی علمائے دین کو 'مُلّا' قرار دیا اور برہمنوں کو اپنے ناجائز مقاصد کے لیے ذات پات کی بنیاد پر انسانیت کو تقسیم کرنے کا موردِ الزام ٹھہرایا۔ شیخ العالمؒ نے اپنے اشعار میں میر محمد ھمدانیؒ کی مدح " ذہین ترین باپ کا ذہین ترین بیٹا"، کہہ کر کی۔ ان جذبات کے بدلے میں حضرت میر نے مذکورہ دستاویز عطا کی، اس کی سلطان سکندر سے تصدیق کروائی اور حضرت شیخؒ کے طریق کار کو مطابق شریعت ہونے کا اعلان کر کے اور ان کی برگزیدگی کو دستاویزی تسلیمیت دے کر تنازعہ کو ختم کیا۔

حضرت میرؒ کی یہ کارروائی بھی ان دیگر غیر ملکی علماء کے ساتھ ان کے اختلاف کی ایک وجہ تھی جن میں سیّد محمّد حصاری بھی شامل تھے اور جو بنیاد پرستی کے نظریے کی نمائندگی کرتے

تھے ۔میرؒ کو یقین تھا کہ شیخ العالمؒ کے ہاتھوں میں دین کے مفادات محفوظ ہیں ۔ چنانچہ وہ خود حج بیت اللہ کو چلے گئے اور پھر کبھی کشمیر واپس نہیں آئے ۔

پس حضرت شیخؒ اگر اس اعتبار سے انتہائی خوش قسمت تھے کہ انھیں حضرت شاہ ہمدانؒ کی سرپرستی حاصل رہی، للہ عارفہ سے ماں کا پیار ملا اور حضرت میر محمد ہمدانیؒ کی علمی اور روحانی صحبت میسر ہوئی لیکن ان میں سے کسی سے بھی انھوں نے باقاعدہ تربیت نہیں پائی ۔ شیخؒ صریحاً اویسی صوفی سلسلے سے تعلق رکھتے تھے اور انھوں نے براہ راست حضرت محمد مصطفیٰ سے روشنی حاصل کی ۔ انھوں نے اپنا حسب نسب واضح طور پر اپنے اشعار میں بیان کیا ہے ۔ ذیل کی مختصر نظم ان کے روحانی سلسلۂ نسب کو واضح کرتی ہے ؎

اوّل ریشی محمدؐ ریشی
دوسرے اویسِ قرنیؒ ہیں
تیسرے ریشی زلکا ریشیؒ
چوتھے حضرت پلاسؒ ہیں
پانچویں ریشی میراں ریشیؒ
چھٹے رُمہ ریشیؒ ہیں
مجھ ساتویں کو نظرانداز کیا گیا[1]
میں کون سا ریشی ہوں، میرا کیا نام ہے !

عارف و شاعر نے اس طرح غیر مبہم انداز سے خود کو اویسی ریشی کہا ہے ۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ حیثیت اور مرتبہ انھیں کشمیر کے اُن مقامی بزرگوں سے ورثہ میں ملا جن کا براہ راست روحانی تعلق سرورِ کائنات حضرت محمدؐ سے تھا ۔

اس باب کو ختم کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ حضرت شیخؒ کے خورد و نوش کی عادتوں

---

[1] اصل مصرعے کا ترجمہ یوں ہے ؎
مجھ ساتوں کو بھی اسی شمار میں رکھا گیا ۔ (ایڈیٹر)

کا بھی ذکر کیا جائے۔ ان کی غذا، سادہ ہوتی تھی۔ اگر چہ وہ غار نشینی سے قبل بھی سادہ غذا پر ہی گزارہ کرتے تھے، تاہم یہ معلوم نہیں کہ وہ تب بھی گوشت کھانے سے پرہیز کرتے تھے یا ایسا انھوں نے بعد میں کیا۔ یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ انھوں نے زندگی کے آخری ایام میں دالوں کا استعمال خال ہی کیا۔

حضرت شیخؒ سادہ لباس پہنتے تھے جو مشتمل تھا صرف کھردرے چادر سے تیار کیے ہوئے ایک پھرن (کشمیری گون) پر۔ روایت ہے کہ زندگی کی آخری سانس تک وہ اس کا استعمال کرتے رہے۔ یہ "پھرن" ان کے آستان عالیہ میں تبرک کی حیثیت سے محفوظ ہے ؎

خوف اور ڈر کی وجہ سے میں مادّی دنیا سے کنارہ کش ہوا
اور میں نے ساری عمر ایک ہی "پھرن" پہنا
صبر و قناعت سے میں نے تضادات کی دنیا کو فتح کیا
اور اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے سارے سنسار کی سیر کرلی۔

حضرت شیخؒ اپنے مریدوں کو اپنی اولاد سمجھتے تھے، بدلے میں وہ بھی محبّت، تابعداری اور خلوص و وفا کا مظاہرہ کرتے تھے۔ ان کے مریدوں کا حلقہ کافی وسیع تھا۔ ان میں برہمن، ٹھاکر، مقامی علماء، اور سادات بھی شامل تھے۔

حضرت شیخ نورالدینؒ نے ساٹھ سال اور کچھ ماہ کی عمر پائی۔ ۲۶ ر جمادی الثانی ۸۴۲ھ (مطابق ۱۴۳۸ء) کو رو پہ ون گاؤں میں آپ نے رحلت فرمائی۔

جوں ہی ان کی وفات کی خبر پھیل گئی، مقامی ریشی بزرگوں کی قیادت میں کشمیر کے تمام علاقوں سے لوگوں کے وفود پہنچ گئے اور دو دن کے اندر مختلف خطّوں سے آئے ہوئے ۹ لاکھ سے زیادہ لوگ جمع ہو گئے۔ انھوں نے حضرت شیخ کے جسد پاک کو اپنے اپنے علاقے میں دفن کرنے کا حق جتایا۔ اس موقعہ پر خود سلطان زین العابدین بھی موجود تھا۔ اس نے اصرار کیا کہ میّت کو دفنانے کے لیے سری نگر لایا جائے۔ بالآخر عوام کے جوش کو دیکھ کر حضرت شیخؒ کے خلیفۂ اوّل حضرت بابا نصرؒ تابوت کے قریب گئے۔ فوراً بعد وہ اشتیاق سے انتظار کرنے والے لاکھوں حاضرین کی طرف لوٹے اور انھیں یقین دلایا کہ میت اپنی آخری

آرام گاہ خود متعین کرے گی۔ چنانچہ اس پر لوگ مطمئن ہوئے۔

اس کے بعد میّت کو غسل کے لیے لیا گیا۔ غسل چرار میں اخروٹ کے درخت کے ایک بڑے تنے پر انجام دیا گیا۔ جنازہ بھی وہیں ایک پہاڑی ٹیلے پر پڑھا گیا۔ بعد ازاں تابوت خود بخود آسمان کی بلندیوں کی جانب اُڑ گیا۔ مختلف خطوں کے لوگ آسمان کی طرف اشتیاق سے دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے محسوس کیا کہ تابوت کا رخ ان کے اپنے اپنے علاقے کی جانب ہے اس لیے وہ اپنے مقبول ولی کی آخری رسوم انجام دینے کے لیے فرطِ شوق میں اپنے اپنے علاقوں کی طرف واپس دوڑے۔ نتیجے کے طور پر مجمع کم ہو گیا اور یہاں چرار کے ریشی مرکز میں رہنے والوں کی ایک محدود تعداد رہ گئی۔ تیسرے روز بابا نصرؒ نے پوری قوم پر ظاہر کر دیا کہ تابوت چرار میں ایک خاص جگہ، گلابوں کی ایک جھاڑی کے نزدیک زمین میں اُتر گیا ہے اور یوں تدفین خود بخود مکمل ہوئی ہے۔ بابا نصرؒ نے اس جگہ کی نشاندہی بھی کی۔ سلطان زین العابدین نے خامپور سرایہ کے نزدیک واقع شاہی گودام سے تعمیری سامان لے جانے کا حکم دیا اور حضرت شیخ کے مقبرے کے اردگرد ایک تعمیر کھڑا کی گئی۔ حضرت شیخؒ کے خلیفہ اوّل بابا نصرؒ اس آستان کے پہلے مجاور بن گئے۔ خلافت کا یہ سلسلہ سولہویں صدی تک جاری رہا تا آنکہ جنید ریشی نے اسے موروثی عہدہ بنا دیا۔

ژارَن جو ایک گھنا جنگل تھا اور جہاں مقامی زمیندار اپنے مویشی چرایا کرتا تھا، رہائش اور بودوباش کے قابل بننا شروع ہوا اور اب یہ علاقہ ضلع بڈگام کا سب سے بڑا اور گنجان آباد قصبہ ہے۔ کچھ عرصہ بعد ژارَن، ژرار بن گیا اور پھر ژرار شریف (چرار شریف یہ سری نگر کے جنوب مغرب میں واقع ہے اور اس کی آبادی آٹھ ہزار کی ہے حضرت شیخ العالمؒ نے اس جگہ کے بارے میں خود ہی کہا تھا ؎

میں اسی منتخب کی ہوئی جگہ، پر خدا کو تلاش کروں گا

"ژارن" کے لغوی معنی ہیں "تلاش کرنا" یا "منتخب کرنا"۔ ذیل میں حضرت شیخ کی ایک مختصر نظم پیش کی جاتی ہے جو ان کے سوانحی حالات کے تعلق سے بعض اشارے فراہم کرتی ہے ؎

میں پیدا ہوا تو پالنے سجائے گئے
تین سال کا ہوا تو میرے ہاتھ باندھے گئے
بارہویں سال میں میرا ضمیر روشن ہوا
پندرہویں سال میری شادی ہوئی
سولہویں سال میں میرے شعور کی ندی میں سیلاب آگیا
اٹھارویں سال میں ابدی عشق کی گود میں گرا
اپنی عمر کے بیسویں سال میں
میرے اندر کی آگ سوزِ عشق سے جل اٹھی
پچیسویں برس میں، میں الزامات کا شکار رہا
تیس برس کا ہوا تو میری جوانی ڈھل گئی
عمر کی پانچویں دہائی میں مجھے دنیا میں گھومنا پڑا
ساٹھ برس کا ہونے پر مجھے اپنی قبر تک لیا جائے گا۔

چار

ریشُت (ریشیت)

"ریوش" لفظ "ریشی"، کا کشمیری متبادل ہے۔ سنسکرت میں اس سے مراد وہ شخص ہے جو خدا کی حمد گاتا ہو۔ لیکن کشمیری میں یہ لفظ اس قدر لچک دار بن گیا کہ اس سے مُراد وہ روحانی پیشوا بھی لیے جاتے ہیں جنھوں نے انسانیت کی خدمت کی خاطر اپنی زندگی عبادت و تفکّر کے لیے وقف کر دی اور جو آئندہ نسلوں کے لیے اقوال زرّیں کا ایک خاصا سرمایہ چھوڑ گئے۔ حضرت نورالدّین ولیؒ نے اس لفظ کو نئی جہات عطا کیں۔ تاہم بعد کے مؤرخوں اور تذکرہ نگاروں نے اس اصطلاح کی تعریف کرتے ہوئے کئی طرح کے انحرافات سے کام لیا۔ بعض نے اس کی اصل کا رشتہ فارسی لفظ "ریشی"، سے جوڑ دیا جس کے معنیٰ "زخم"، کے ہیں اور بعض نے اس کے لغوی معنیٰ تک ہی اسے محدود رکھا۔

ریشی سلسلہ کلی طور پر روحانی تحریک ہے جو اس زرخیز زمین میں کئی صوفی تحریکوں کے باہمی اثر و عمل کے فطری نتیجہ کے بطور فروغ پا گئی۔ کشمیر شیو فلسفہ کا گہوارہ تھا اور بدھ مت کے اثرات اس ماحول میں گہرے طور پر سرایت کر چکے تھے۔ ان فلسفوں کے اثرات لل عارفہ اور شیخ العالمؒ دونوں کے یہاں ملتے ہیں۔ کشمیر کے پہاڑی سلسلوں میں دینِ اسلام، ایران کے صوفی بزرگوں کی مساعی سے متعارف ہوا۔

کشمیر اصل میں ایک سیم زدہ علاقہ تھا جسے "ستی سر" کہتے تھے۔ روایت ہے کہ اس علاقہ کے آس پاس ایک آسیب رہتا تھا اور اس کا آبادی پر خوف طاری تھا۔ کشپ ریشی کی کرامات کے باعث بارہ مولہ کے نزدیک۔ پانی کی نکاسی کا راستہ بن گیا اور (دیو) آسیب کو مار گیا۔ بعد ازاں انسان نے اس شاداب و دلکش وادی کو رہنے بسنے کے قابل پایا۔ اس

لحاظ سے اس سرزمین کی بنیاد ہی ایک ریشی کی کرامات سے منسوب ہے اور یوں کشف و کرامات، فوق الفطری کارنامے اور مابعد الطبیعاتی روایت اس کے تہذیبی جوہر کی ناگزیر شے بن گئی۔ کشمیر کے اس قومی کردار کے باعث اس کی مٹّی میں صرف وہ تحریکیں جڑ پا سکیں جو روحانی برتری کی حامل تھیں، جنھوں نے بلند آدرشوں کا پرچار کیا۔ باطنی عظمت کا درس دیا اور معجزاتی کارنامے انجام دیئے۔ یہی پس منظر تھا جس کی رو سے یہاں بدھ مت بھی پھلا پھولا اور شیومت کا بھی کافی عرصہ یہاں کے مذہبی منظر نامے پر غلبہ رہا۔ ایسے سماجی و مذہبی منظر نامے میں اسلام اور اس کی متصوفانہ تعلیمات کو چودھویں صدی عیسوی کے دوران سازگار ماحول ملا۔ بودھ راہبوں نے اپنا جوش و ولولہ کھو دیا تھا اور مقامی برہمنوں کی صفوں میں منافقانہ روّیہ داخل ہوگیا۔ لہٰذا زمین تبدیلی کے لیے بالکل زرخیز تھی۔

ان صوفیوں کے خیالات مقامی فلسفوں کے اصولوں کے کم و بیش قریب تھے۔ وادی میں در آنے سے پہلے ہی تصوف پر بودھ فلسفے کے کچھ حد تک اثرات پڑ چکے تھے اس لیے یہاں کی عوامی سوچ نے اسے کسی طرح جانا پہچانا پایا۔ تصوف کی تعلیمات کے ساتھ مقامی شیو فلسفہ اور بدھ مت کے تصوّرات کی آویزش و آمیزش نے ایک نئے روحانی سلسلے کے ظہور کے لیے نظریاتی مواد فراہم کیا جو کشمیر کی گہری روایات اور اس کی جنت نظیر فضاء کے لیے انتہائی موزون تھا۔

اس نظریاتی پس منظر کے علاوہ مثبت اور منفی، ہر دو نوعیت کی، بعض ایسی عملی مجبوریاں بھی تھیں جنھوں نے تصوّف کے ایک نئے سلسلے کے ظہور میں آنے کی خاطر زمین ہموار بنا دی۔

صوفی رہنماؤں کے ہاتھوں کشمیر میں جو بڑے پیمانے پر تبدیلیِ مذہب عمل میں آئی اس سے شروع شروع میں برہمن اور مقامی مذہبی رہنما سر د پڑ گئے لیکن بعد میں انھوں نے صورت حال کی سنجیدگی کو بھانپ لیا اور اپنی صفوں کو پھر سے مستحکم کرنا شروع کیا۔ دوسری طرف سینکڑوں سادات، علماء اور مشائخ حضرت شاہ ہمدانؒ اور ان کے فرزند حضرت میر محمد ہمدانؒ کے ہمراہ کشمیر آئے تھے جنھوں نے جگہ جگہ اپنی سرگرمیوں کے مراکز اور ذیلی مراکز

قائم کیے تھے۔ اس صورت حال سے فریقین کے درمیان تصادم کا خطرہ لاحق ہو گیا۔ لہٰذا ایک مصالحت آمیز تیسری قوت کی قرار واقعی ضرورت کھڑی ہوئی جو ایک طرف اس تصادم کو ہمیشہ کے لیے ختم کرتی اور دوسری طرف روحانیت کی طرف مائل سماجی نظام کی تشکیل کرتی۔

ان دونوں کیمپوں میں سب کے سب مخلص نہیں تھے اور نہ سبھی اپنے اپنے مقاصد کے تئیں باشعور اور جینوین تھے۔ غیر ملکی مبلغین میں خاصی تعداد ایسے سادات کی تھی جو تیمور کے ظلم و استبداد کی وجہ سے ان منصبوں، رتبوں اور آسائشوں سے محروم ہو گئے تھے جو انھیں اپنے اپنے وطن میں حاصل تھیں۔ جب انھوں نے کشمیر میں پناہ لی تو یہاں انھیں اپنے سماجی و سیاسی مرتبہ کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے حالات سازگار معلوم ہوئے۔

اسی طرح مقامی برہمنوں نے، جن کا کشمیر کے سیاسی منظر نامے پر صدیوں تک تسلط تھا، اپنے منصب و مقام کو خاک ہوتے ہوئے محسوس کیا۔ وہ بھی اپنے کھوئے وقار اور مرتبہ کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے کشمیر کے سیاسی نظام اور سماجی و مذہبی زندگی، ہر دو میں گہرائی سے سرایت کر گئے۔ اس صورت حال سے تصادم کا شدید خطرہ پیدا ہو گیا۔

سلطان سکندر کے وزیر اعظم سیف بھٹ (سابق سہ بھٹ) جیسے بے حد جوشیلے نومسلموں نے مذہبی تعصب کی ایک نازک اور پیچیدہ صورت حال پیدا کی تھی۔ دوسری طرف اس کے کچھ چچیرے بھائی بھی جنھوں نے اپنا مذہب تبدیل نہیں کیا تھا، شاہی دربار میں مضبوطی سے جمے ہوئے تھے اور شر انگیز نوکر شاہی کا حصّہ تھے۔ سیف بھٹ کے کھلم کھلا جارحانہ انداز اور شاہی نجومیوں، درباری حکیموں اور دیگر عہدیداروں (جو پہلے برہمن تھے) کی اندرونی سازشوں نے کشمیر کو خطرے کے دہانے پر لا کھڑا کیا تھا۔ انتہا پسندی کی اس طرح کی حکمت عملیوں کو قابو میں رکھنا وقت کی اہم ضرورت تھی۔ صرف جذبات میں گہری طور پر پیوست ایک شعوری مذہبی تحریک ہی اس کا مناسب و موزون توڑ کر سکتی تھی۔

ایک طرف جماعتی تبدیلیِ مذہب کی حصولیابی کو مستحکم کرنے اور اس کے مقصد کو دائمی

بنانے کی ضرورت تھی تو دوسری طرف ایک ایسے سیاسی نظام کی بھی ضرورت تھی جو ہر فرقے کو آزادیِ عبادت کی ضمانت دے دیتا۔ حضرت شیخؒ نے دستیاب خام مواد کی بنیاد پر ایک پائیدار سماجی و مذہبی نظام کی تشکیل کی جسے " ریشِت " (ریشیت) کہتے ہیں۔

ریشی سلسلے کی تعریف اور اس کے مفہوم کے تعلق سے بعد کے مؤرخوں اور تذکرہ نگاروں نے جو الجھنیں پیدا کیں وہ گمراہ کن ہیں۔ مابعد کی تمام تاریخیں، سوانح عمریاں اور تذکرے فارسی میں ہیں اور ان مصنّفین نے اپنی تصانیف میں " ریوش " کا ترجمہ " ریشی " اور " ریشِت " کا ترجمہ " ریشیت " کیا اور یوں ان مقامی اصطلاحوں کے معنیٰ فارسی لغات میں تلاش کیے۔ اس قسم کی تحریروں کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ فارسی تاریخوں نے لسانی اعتبار سے اپنی مخصوص صوتیات سے مطابقت پیدا کرنے کے لیے کشمیر کے دیہات اور مقامات کے نام بھی مسخ کیے ہیں۔ لہٰذا ان فارسی ماخذات سے ریشی مسلک کی صحیح تعریف، مفہوم اور اس کی حدود کو مشکل ہی سے جانا جاسکتا ہے۔ بعد کی اردو اور انگریزی تصانیف نے بھی اس موضوع سے متعلق اپنی بحث کی بنیاد ان ہی ماخذوں پر رکھی۔

حضرت شیخ العالمؒ خود کو ساتویں ریشی کہتے ہیں حالانکہ وہ حقیقت میں اس کے بانی ہیں۔ اس لحاظ سے اس مسلک کے مفہوم اور اس کے اصلی جوہر کو جاننے کے لیے ہمیں خود مسلک کے بانی کے کلام کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ اپنی نظم میں 'سچّے مسلمان' کی تعریف کرتے ہوئے انھوں نے کہا ہے ؎

وہ جو دُور بنوں میں خلوت گزیں ہوا
من کی مراد پانے کے لیے اپنی جان داؤ پر لگا دی
نفس کو قابو میں رکھا اور صابر و شاکر رہا
اپنی ذات کو خاک سمجھا
گوشہ نشینی میں حقیقت مطلق پر تفکّر کیا
فقط وہی مسلمان کہلانے کا حق دار ہے۔

ایک اور نظم میں ریشی کے اوصاف کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں ؎

ریشی اگر واقعی ریشیت کے پابند ہوتے
تو اپنے عمل کے اشکوں سے پتھّر کو موم بنا دیتے
لیکن افسوس! وہ اس پر کاربند نہیں ہیں
اور غصّہ، حسد اور نفرت کی آگ میں جل رہے ہیں

سچّے ریشی اور ریاکاروں میں فرق کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں ؎

ریشی تو وہ تھے
جو چھیتڑوں سے تن ڈھانپتے
جَو کی چوکر بھیک میں پاکر
دوُر بنوں میں گیان کرتے

آج کے ریشی دکھاوے کے ریشی ہیں
ترک لحم کا دعویٰ کرتے ہیں
لیکن چوری چھپے لذّات کا لطف لیتے ہیں
خُدا کے لطف وکرم کو بھول جاتے ہیں
یہ اگر ریشی ہیں تو کیسے اور کیوں کر؟

یہ اور اس طرح کے دوسرے اشعار ریشی مسلک کے بارے میں مندرجہ ذیل معلومات فراہم کرتے ہیں:

۱۔ یہ مسلک کشمیر میں کافی عرصہ سے رائج تھا۔
۲۔ فطرت کی آغوش میں خلوت گزیں ہونا اس کی حکمت عملی تھی۔
۳۔ ان تھک ریاضت وعبادت اس کا منشور ہے۔
۴۔ ترک لحم ریشی مسلک کا خاصا ہے۔ چنانچہ غذائی ضروریات کی حد تک بھیک مانگنے کی بھی اجازت ہے۔
۵۔ نفس کشی وہ بنیادی راستہ ہے جس پر چل کر ریشی اپنی منزل مقصود کو پا سکتا ہے۔
۶۔ نفس امّارہ پر قابو پانا اس مسلک کی شرط اوّلیں ہے۔

۷۔ غصہ، حسد، شہوانیت، ہوس اور غرور ریشی اخلاقیات کی رو سے قابلِ معافی گناہ ہیں۔

۸۔ منکسرالمزاجی ریشی مسلک کا بنیادی وصف ہے۔

۹۔ گوشہ نشینی کے کرب کو سہہ لینے کا واحد مقصد کائنات کی سچائیوں، حقیقت مطلق اور زندگی اور روح کی حقیقت پر غور و فکر کرنا ہے۔

دوسرے اشعار سے ریشی مسلک کے جو اہم ترین تقاضے اُبھرتے ہیں وہ یوں ہیں:

۱۔ انسانیت کی خدمت کرنا، ضرورت مندوں کی مدد کرنا اور بیماروں، ناتوانوں اور کمزوروں کے کام آنا۔

۲۔ جانداروں کو تکلیف پہنچانے سے گریز کرنا، چاہے وہ نباتات کی شکل میں ہوں، کیڑے مکوڑوں کی شکل میں یا حیوانات کی شکل میں۔

اپنے مسلک کے نظریہ و عمل میں ان زائد تاکیدات کے ساتھ ریشیوں نے خاص طور پر اسلام کی تعلیمات کی اشاعت کی، توحید کے جوہر کو لوگوں کے ذہنوں میں نقش کیا اور انھیں عشقِ رسولؐ کے جذبے سے سرشار کیا۔

جیساکہ ذکر ہو چکا ہے، ریشی مسلک کا آغاز حضرت شیخؒ سے نہیں ہوتا۔ ان سے پہلے بھی کشمیر میں خاصی تعداد میں مشہور مسلمان ریشی ہو گزرے۔ حضرت شیخ نے اپنے کلام میں بعض ایسے ریشیوں کے بے کم و کاست سوانحی خاکے فراہم کیے ہیں جو ان کے پیش رو رہے ہیں۔ زُمہ ریشی نے، جن کا نام "لافانیت" کا مترادف بن گیا ہے، اپنی طویل عمر ریاضت و عبادت میں گزاری۔ پلاسمن ریشی، خلاسمن ریشی اور یاسمن ریشی حضرت شیخ کے نزدیک ترین پیش رو تھے۔ لیکن اس کے باوجود ریشی تفکّر کا روایتی طریقہ کار خال خال ہی نظر آتا تھا۔ ریشی بکھرے ہوئے تھے اور ریاست کی سماجی و معاشی زندگی اور سرکاری امور پر ان کا اثر نہ ہونے کے برابر تھا۔ یہاں تک کہ مذہبی زندگی پر بھی ان کا اثر برائے نام تھا۔ اس کے برعکس حضرت شیخؒ نے "ریشیت" کے اصولوں پر مبنی ایک باقاعدہ مذہبی نظام تشکیل دیا۔ مخلص ریشیوں کے عملے پر مبنی تحریک منظم کی۔ ایک ایسے صوفی مسلک کی بنیاد ڈالی جس پر اگرچہ عمل پیرا ہونا مشکل تھا لیکن اس کے باوجود اس نے سوسائٹی کے لیے ایک حفاظتی دستہ تیار کیا۔

اس صوفی مسلک کو مقبول بنانے کے لیے حضرت شیخ نے تقریباً ہر پرگنہ یا ضلع میں اپنی تحریک کے مراکز یا ذیلی مراکز قائم کیے۔ ایسے ہر مرکز یا ذیلی مرکز میں آپ کچھ وقت گزارتے، عملے کو خود تربیت دیتے اور پھر اپنے مریدوں میں سے کسی ایک کو ذمہ داری سونپ کر چلے جاتے۔

بڑے سے بڑے رہنما پر بھی تنقید کرنے کی اجازت تھی اور یہی نہیں بلکہ اس روّیے کی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔ ایک دفعہ حضرت شیخؒ اپنے حجرے میں اپنی ایک خاتون مرید یعنی دربہ گام کے سنگی گنائی کی بیٹی کے قریب بیٹھے تھے اور اسے تصوف کے رموز و اسرار بتا رہے تھے کہ اتنے میں ان کے ایک اور مریدِ باصفا بابا زین الدّین حجرے میں داخل ہوئے۔ اگرچہ انھیں اپنے مرشد کے روحانی مرتبہ کا احساس تھا پھر بھی وہ بالواسطہ اشارہ کرنے سے نہیں ہچکچائے کہ کسی عورت سے اس طرح کی قربت ایک اجنبی کے ذہن میں تشکوک پیدا کر سکتی ہے۔

ریشیوں کی اس منظّم جماعت نے اخلاقی قدروں کی نہ صرف اشاعت کی بلکہ خود بھی ان پر کار آمد رہی۔ انھوں نے صرف مذہبی زندگی کے جوہرِ اصلی کی تبلیغ کی بلکہ خود اپنی شخصیتوں کو بھی اسی کے مطابق ڈھالا۔ انھوں نے ضرورت مندوں کی مدد کرنے، کنویں اور نہریں کھودنے اور اونچائی پر رہنے والوں اور مسافروں کے لیے پینے کا پانی فراہم کرنے جیسے کاموں سے انسانیت کی خدمت کی۔ انھوں نے ظلم وجبر، ریاکاری اور کذب گوئی کا پردہ فاش کیا اور ہر طرح کی مذہبی مداخلت کے خلاف آواز اٹھائی۔ لہٰذا اس تحریک کا فوری نتیجہ یہ نکلا کہ سلطان زین العابدین کے دورِ حکومت میں کشمیر میں خوشحالی، رواداری، باہمی سوجھ بوجھ اور اجتماعی ترقی اپنے عروج کو پہنچی۔ موصوف کی حکومت کی پانچ دہائیاں کشمیر کی تاریخ کا سنہری دور قرار دی جاتی ہیں۔ یہ صرف بادشاہ کی کشادہ ذہنی کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ خود اس کی حکمت عملیاں اُس خاموش انقلاب کا نتیجہ تھیں جو ریشی تحریک نے حکمرانوں اور رعایا، دونوں کے ذہنوں میں لایا۔

ریشی تحریک پورے جوش وخروش کے ساتھ ترقی کر گئی۔ کشمیر کے سبھی علاقوں میں ریشی

مراکز قائم ہوئے۔ اگرچہ ریشیوں کو ملک کے انتظامیہ سے کوئی سروکار نہیں تھا لیکن کوئی بھی سیاسی قوّت ان کی ناراضگی مول نہیں لے سکتی تھی۔ یہاں تک کہ چک دَور میں سیاسی طور پر مظلوم لوگوں نے ریشی مرکزوں میں پناہ لے لی۔ لیکن بعد میں حکومت کی نظر میں غیر پسندیدہ اشخاص کو پناہ دینے کی پاداش میں ریشیوں کو اذیّتیں پہنچائی گئیں۔ یہی وجہ ہے کہ ریشیوں نے اپنی بود و باش کی جگہیں چھوڑ دیں اور وہ ملک کے دوسرے حصّوں میں چلے گئے۔ تاہم اس کے باوجود وہ ایذا رسانوں کے ظلم سے نہ بچ سکے اور اس طرح عام استعمال کا یہ محاورہ بن گیا کہ

رِیشہ ژلِہ پننہِ دیشہِ   تو تہِ ژلس نہ ریشی ناو

(ریشی اپنی جائے بود و باش سے دور بھی چلا جائے، اپنے ریشی نام (کے دھبّے) سے بھاگ نہیں سکتا۔)

اپنے ایک شعر میں زین الدّین ولیؒ خبردار کرتے ہیں کہ "ریشیوں کو بُرے دنوں کا سامنا ہے"۔ یہ بیان اس بات کا بالواسطہ لیکن تسلّی بخش ثبوت فراہم کرتا ہے کہ ریشی تحریک سیاسی و سماجی نظام سے متصادم ہوئی تھی اور زین الدّینؒ کو یقین تھا کہ یہ صورت حال محض قربانیوں ہی سے دور ہو سکتی ہے۔

پانچ

سازشیں

تذکرہ نویسوں، سوانح نگاروں اور بعد کے مؤرخوں نے حضرت شیخؒ کی زندگی میں رونما ہونے والے بعض واقعات کا حوالہ دیا ہے لیکن ہر ایسے واقعہ کو اپنے انداز سے پیش کیا ہے۔ ان واقعات کو مناسب شکل میں ترتیب دینے اور ان کا من حیث المجموعہ مطالعہ کرنے کے بعد بلا خوفِ تردید یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ واقعات ایک خاص سلسلۂ حالات کی کڑیوں پر مشتمل ہیں جو محض اس حقیقت پر منتج ہے کہ حضرت شیخؒ اور ان کے عملے کے چاروں طرف سازشوں کا ایک جال بُنا ہوا ہے۔

غار کے اندر حضرت شیخ کے دو بچوں کی موت کے بعد کسی نے ڈاڈہ سر (ترال) میں ان کے سسرال والوں کو اطلاع دی، جنھوں نے شیخؒ کے خلاف شکایت درج کروائی۔ چنانچہ ان کی گرفتاری کا حکم جاری ہوا جس کی تعمیل کا کام بدنام زمانہ پولیس افسر تازی بھٹ کے سپرد کیا گیا۔

اس واقعہ کو دو بچوں کی اچانک موت کا منطقی ردِّعمل کہا جا سکتا ہے لیکن اگر ہم اسے دوسرے حالات کے ساتھ جوڑیں اور اس کے ڈرامائی پن کا خیال کریں تو اُسے اس قدر معمولی قرار نہیں دیا جا سکتا۔

دوم، جیساکہ ہم نے (پچھلے صفحات میں) دیکھا، بعض عناصر نے، جو شاہی دربار سے بہت قریب تھے، ایک عجیب ڈھنگ سے سلطان کے کان بھر دیئے تھے۔ ریاکار عناصر نے صورت حال کا فائدہ اٹھایا اور سلطان کی لاعلاج بیماری کو کسی ایسے "قصاب" کی "ریاکاری" کے گناہ آلود اور دھوکہ باز کرتوتوں سے منسوب کیا کہ جس نے لوگوں کو ٹھگنے کے لیے عارف کی

نقاب پہن رکھی تھی۔ بادشاہ نے طیش میں آکر گرفتاری کا حکم دیا لیکن حضرت شیخ نے جس جوابی عمل کا مظاہرہ کیا اس نے ان سب کے چھکے چھڑا دیئے۔ یہاں بعض ایسے سوالات ضرور اُبھرتے ہیں جن کا مناسب طور پر جواب دینا لازمی ہے۔ آخر ان اہلکاروں نے من گھڑت کہانی کیوں بنائی؟ انھوں نے ایک ایسے "فقیر" کو بدنام کیوں کیا کہ جس کا ان کے ساتھ کوئی جھگڑا نہیں تھا؟۔ جواب بہت صاف ہے۔ حضرت شیخؒ کے ساتھ براہ راست ان کی کوئی دشمنی نہیں تھی۔ انھوں نے دراصل کسی سازش کے ایجنٹوں کی حیثیت سے ایسا کیا۔

سوم، پُرکشش اور نازنین رقاصہ "یاون مڑ" کا واقعہ بھی سازشوں کے سلسلے کی کوئی کم اہم کڑی نہیں تھی۔ اس ناچنے والی لڑکی کو کس نے اور کس مقصد کے تحت بھیجا تھا؟۔ تاریخی تصانیف اور سوانحی تحریروں میں بکھرے پڑے مواد میں اس سوال کا بھی کوئی جواب نہیں ملتا۔

یہ بات ذہن نشین کی جائے کہ تذکرہ نگاروں نے بعد میں ان دونوں واقعات کو فرقہ وارانہ رنگ دیا اور دیگر ایسی تاویلات پیش کیں جو مشکل ہی سے معقول کہی جاسکتی ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ شاہی طبیب اور نجومی ہندو تھے۔ طبیبوں کو شاہی عتاب سے بچانے کی خاطر نجومیوں نے حضرت شیخؒ کو قربانی کا بکرا بنایا۔ لیکن اپنے ہم مذہب ویدوں اور حکیموں کو بچانے کے لیے انھوں نے حضرت شیخؒ کو ہی کیوں منتخب کیا؟ ایسا کسی خفیہ منصوبے یا خاص محرکات کے بغیر نہیں ہوسکتا تھا۔

"یاون مڑ" کے واقعہ کا پس منظر بیان کرتے ہوئے ان سوانح نگاروں نے ایک بار پھر ناقابلِ اعتبار حکایت گڑھ لی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک شہزادہ شکار کھیلنے کے لیے علاقہ پھیکھ (جہاں اب مغل باغات واقعات ہیں) گیا تھا۔ واپسی پر اس نے اِشبر کے نزدیک ایک سادھو کے آشرم کی جانب لوگوں کی ایک خاصی تعداد کو جاتے ہوئے دیکھا۔ شہزادہ بھی تعظیم بجالانے کے لیے آشرم میں داخل ہوا لیکن سادھو نے اسے ملاقات دینے سے انکار کیا۔ شہزادہ مایوس ہوا اور اس نے محسوس کیا کہ سادھو کا طرزِ عمل ریاکارانہ ہے۔

چنانچہ اس کے کردار کو پرکھنے کا ارادہ کیا اور اس مقصد کی خاطر ایک مشہور نرتکی کو بھیجا گیا۔ اپنی دلفریب اور دلکش اداؤں سے اس نے سادھو کا ذہن مدہوش کیا۔ جو بالآخر ایک کمزور کردار کا شخص ثابت ہوا۔ معمولی سی عورت کے ہاتھوں اس کی ذلّت کو ہندوؤں نے برملا توہین سمجھا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے انتقام کا نشانہ حضرت شیخؒ کو بنایا۔

انتقام کی خاطر ہندوؤں کو کیوں حضرت شیخ کو ہی چننا تھا جبکہ بادشاہ کے کسی رشتہ دار یا شہزادے سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا! انھوں نے غیر ملکی صوفیوں میں سے کسی کا انتخاب کیوں نہیں کیا کہ جن کے اقتدار کی کرسی سے قریبی تعلقات تھے اور جو نظریہ اور عمل دونوں میں متعصبانہ حد تک قدامت پسند تھے۔ اس کے برعکس حضرت شیخؒ کا طرز عمل مقامی ہندو فلسفہ کے قریب تھا۔ انھوں نے اپنے ہم وطنوں کے جذبات کا پاس کرتے ہوئے نہ صرف ترکِ لحم کیا تھا بلکہ ان کے طریقۂ عبادت و تفکر کو قدامت پسند ملاّؤں نے "ہندویانہ" قرار دیا تھا۔ سلطان سکندر کے دور میں حد سے زیادہ جوشیلے نومسلم وزیر ملک سیف الدّین نے فرقہ وارانہ کشیدگی کی صورت حال پیدا کر دی تھی۔ حضرت شیخ نے اپنے قول اور فعل دونوں سے اس طرح کے مذہبی تعصب کے خلاف آواز اُٹھائی۔ آخر پر یہ کہ ایسے وقت میں جب تمدن اور روایات پر زوال کے آثار غالب آرہے تھے حضرت شیخ کشمیری روایات کے محافظ ثابت ہوئے۔ ان حالات میں وہ کشمیر کے کاذ کے واحد حامی و ناصر اور مقامی ہندوؤں کے نجات دہندہ تھے۔ پھر اسی فرقے کے لوگ اپنے ہی محافظ اور حامی و ناصر کو بدنام کرنے کے لیے بھلا کیوں چنتے؟ اس لحاظ سے بعد کے تذکرہ نگاروں نے جو تاویلیں پیش کی ہیں۔ وہ بہت ہی کمزور اور بودی ہیں۔ تاہم اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حضرت شیخ کے خلاف ایک منظّم سازش کام کر رہی تھی اور اس طرح کی سازشوں کا مرکز و منبع خود دربار کے اندر تھا۔

جونراج نے ملاّ نورالدّین کی گرفتاری اور نظر بندی کا جو ذکر کیا ہے وہ مذکورہ بالا حالات کے پیش نظر حضرت شیخؒ ہی کے بارے میں ہے کسی اور کے بارے میں نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ حوالہ اسی نورالدّین کے بارے میں ہے جسے تیمور نے سلطان سکندر کے یہاں سفیر بنا کر

بھیجا تھا[۱]۔ اس دلیل کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ ایسے کوئی متعلقہ واقعات نہیں ملتے جن سے یہ ظاہر ہو کہ اس سفیر نے سلطان کو اس حد تک ناراض کیا تھا کہ موخرالذکر نے مسلّمہ سفارتی اصولوں کے خلاف ورزی کرنے کا خطرہ مول لیا۔ یہ دعویٰ اس وجہ سے اور بھی ناقابل یقین بن جاتا ہے کہ سلطان کبھی سفارتی تحفّظات (Immunities) کی خلاف ورزی نہ کرتا اور نہ ہی تیمور جیسے انتہائی طاقتور اور خوفناک حکمران کی ناراضگی کو دعوت دیتا۔ ان حالات کے پیش نظر "ملّا نورالدین"، جنھیں جونراج کے مطابق سلطان سکندر نے گرفتار کیا تھا، کوئی اور نہیں بلکہ حضرت شیخ نورالدّین ہی تھے۔

مطلب صاف ہے۔ ان کی عوامی مقبولیت اقتدار کے بھوکے اہلکاروں کے لیے ایک خطرہ تھی۔ مقامی روایات اور تمدّن کی حفاظت کرنے کی ان کی حکمت عملی اُن غیر ملکی عناصر کے لیے برملا توہین تھی جو کشمیریوں کو نیچی نگاہ سے دیکھتے تھے اور جنھیں اپنی اعلیٰ نسبی، علمی برتری اور ثقافتی نفاست پر بڑا گھمنڈ تھا۔ سب سے بڑھ کر وہ عناصر حضرت شیخ کی تعلیمات سے ناخوش ہوئے جنھوں نے اپنے فرقہ وارانہ طرز عمل سے پُرامن سماجی تبدیلی کو درہم برہم کرنے کی کوشش کی لیکن جن کے کام میں حضرت شیخ کے ردّعمل سے خلل پڑا۔ وہ چونکہ کھلے عام شیخ کو شکست دینے میں ناکام ہوئے اس لیے سازشوں پر اُتر آئے۔ لڈی رینہ کی قیادت میں ایک بڑی تعداد میں مقامی برہمن ان کے پاس گئے تاکہ انھیں مغلوب کریں لیکن انھیں شرمسار ہو کر واپس لوٹنا پڑا۔ بعد میں تقریباً یہ سارے برہمن حضرت شیخ کی تنظیم میں شامل ہوئے۔ اسی طرح تین سو مسلمان ملّا شیخ کو بے نقاب کرنے کی غرض سے ان سے ملے لیکن اُلٹے انھوں نے اپنا ہی پول کھلوا دیا۔ حضرت میر سید محمد ہمدانیؒ کے کئی ساتھی اس بات پر بددل ہو گئے کہ ان کے قاید انھیں ایک 'ناخواندہ' اور 'جاہل' فقیر کے پاس لے گئے لیکن ان میں سے سب سے زیادہ

---

[۱] کشمیر کی تاریخوں کے مطابق نورالدین کو سلطان سکندر نے تیمور کے پاس بھیجا تھا نہ کہ تیمور نے سکندر کے پاس۔ مصنّف سے یہاں جو سہو ہوا ہے اس کے باعث اس تعلق سے باقی بحث خاطر خواہ نتیجہ فراہم کرنے میں ناکام ہے۔ (مترجم)

معترض یعنی سید غلام الدّین، حضرت شیخ کا وفادار مرید بن گیا۔ یہاں تک کہ بہت ہی باوقار روحانی پیشوا، نامور عالم اور سیاسی طور پر طاقتور مبلغ حضرت میر محمد ہمدانیؒ نے حضرت شیخ پر تعریفوں کی بارش کی۔ اس سے وہ لوگ خفا ہو گئے جو یکساں مقصد کے تئیں مخلص ان بزرگوں کے درمیان جھگڑے کے متمنی تھے۔

حضرت میر محمدؒ کے 'قانونی دستاویز (خط ارشاد) عطا کرنے کے کچھ ہی عرصہ بعد، کہ جس کی رُو سے حضرت شیخ کے روحانی مرتبہ کو تسلیم کیا گیا تھا، میر اور ایک اور غیر ملکی عالم میر محمد حصاری کے درمیان اختلافات پیدا ہو گئے۔ ہمدانیؒ کی مقبولیت، قوّت اور اہلیت کے سامنے حصاری کوئی مقابلہ نہیں تھا لیکن ہمدانیؒ نے وسیع تر مفادات کی خاطر کشمیر چھوڑ دینا مناسب سمجھا۔

حضرت شیخ کی تنظیم اگرچہ لازمی طور پر غیر سیاسی تھی لیکن بعد میں اسے ایک سیاسی کردار حاصل ہوا جو اکبر کے قائم کیے ہوئے تسلّط کی سامراجی پالیسیوں کے متعارف ہونے تک اور اس کے بعد بھی ریشی تحریک کا مخفی وصف رہا۔

حضرت شیخ کے بعد کے ایک واقعہ کا ذکر اس نظریئے کو مزید تقویت دے گا۔ زین العابدین کے دَور حکومت میں شیخ کے سب سے چہیتے مرید (زین الدین ولیؒ) کو وادی بدر کیا گیا۔ اس واقعہ کے بارے میں جو بیانات ملتے ہیں وہ بے ہودہ ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ سلطان اس فقیر کے پاس گیا لیکن فقیر نے اسے مشرّف بہ ملاقات نہیں کیا اور ناراض ہو کر سلطان نے اس کی جلاوطنی کا حکم دیا۔ اس بات پر مشکل ہی سے یقین کیا جا سکتا ہے کہ بڈشاہ جیسا دانشمند حکمران اس قدر معمولی وجہ پر اپنی نیک نامی کو آئندہ نسلوں کی تنقید کا ہدف بنواتا۔ ظاہر ہے کہ ایسا حکم دو "زینوں" کے درمیان سخت ترین اختلاف کا ہی نتیجہ ہو سکتا تھا۔

بڈشاہ کے والد کے دَور حکومت میں انتہا پسندی کی پالیسیوں نے آپسی مفاہمت کے تار و پود کو نقصان پہنچایا تھا اور حضرت شیخ کی قیادت میں ریشیوں نے مذہبی تعصّب کے خلاف رائے عامہ تشکیل دی تھی۔ لگتا ہے کہ بڈشاہ کے دَور میں جو بہت زیادہ پابندیاں ہٹائی گئیں اس سے مسلمانوں کے مذہبی معاملات میں مداخلت کے مواقع فراہم ہوئے۔ اس حکمت عملی

کا بھی ریشی بزرگ زین الدینؒ نے بُرا مانا۔ زین الدین ولیؒ نے انتہا پسندی کے اس نئے طریقۂ کار کی کھلے عام مخالفت کی۔ اس طرح تصادم کے دروازے کھل گئے۔ تاہم کچھ سال بعد سلطان اپنے کیے پر نادم ہوا اور اس نے زین الدینؒ کو تبّت سے واپس بلایا۔ کشمیر واپس آنے پر ان کا گرم جوشی کے ساتھ استقبال کیا گیا۔ یہ تمام علیحدہ علیحدہ اور بکھرے ہوئے واقعات' جن کا حوالہ مختلف تاریخوں، نورناموں اور ریشی ناموں میں دیا گیا ہے، اس نتیجے کی طرف لے جاتے ہیں کہ ریشی مسلک کی مقبولیت نے ایسے لوگوں کی صفوں میں خلفشار کی ایک زیریں لہر پیدا کی جنھیں سیاسی مراعات حاصل تھیں۔

جیسا کہ ہم نے دیکھا، حاسد سازشیوں نے حضرت شیخ کو "ریاکار" اور "ان پڑھ" کا نام دیا تھا۔ دوسری طرف خود حضرت شیخ نے بھی ریاکار ریشیوں، ذات پات کے حامی برہمنوں اور استحصالی مُلّاؤں کو بے نقاب کیا۔ اس لحاظ سے ایسے بڑے ولی پر اس طرح کی چوٹ کرنا بے بنیاد بھی ہے اور شرانگیز بھی۔ اب ہم یہ دیکھیں گے کہ آیا حضرت شیخ واقعی ان پڑھ تھے یا نہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ بعض علمائے دین نے شیخؒ کو اِن وجوہ کی بنا پر ناخواندہ قرار دیا۔

۱۔ وہ باقاعدہ طور پر کسی مکتب سے نہیں پڑھے۔ ۲۔ وہ سادہ، حلیم اور منکسر المزاج تھے۔ ۳۔ وہ نہ فارسی بولتے تھے نہ سنسکرت اور ۴۔ انھوں نے کشمیری زبان کو اپنے مؤثر ذریعۂ اظہار کے طور پر استعمال کیا جسے برہمن اور مُلّا دونوں، اَن پڑھوں اور جاہلوں کی زبان خیال کرتے تھے۔

بعد میں حضرت شیخ کے پرستاروں نے دو وجوہ کی بنا پر بدنامی کا یہ ٹیکہ" اپنے قاید کے خطاب کے طور پر اپنایا۔ اوّل، ان کے لیے حضرت شیخ ولیِ اُمّی (ان پڑھ ولی) تھے۔ اس لیے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کہ جو نبیِ اُمّی (ان پڑھ نبی) ہیں، کے سچّے پیروکار تھے، اور دوم' شیخ کے حکیمانہ اقوال، فلسفیانہ تاثرات، نازک مذہبی معاملات کے علم اور تصوف پر دسترس اور قدرت — سب کو ان کی روحانی قوّت سے منسوب کیا جاتا تھا۔

یہ حقائق کی صریحاً غلط عکاسی ہے۔ حضرت شیخ کے اشعار یہ باور کرانے کے لیے کافی یقین بخش دلائل پیش کرتے ہیں کہ انھیں اسلام، تاریخ کشمیر، شیو فلسفہ اور بودھ تعلیمات کا

کافی مطالعہ تھا۔ یہاں اس ضمن میں مختصر اشارے کیے جاتے ہیں کیونکہ تفصیلی بحث ممکن نہیں:

(الف) حضرت شیخ کی شاعری کشمیر کی تاریخ اور مسلمانوں کی تاریخ، دونوں کے حوالوں سے بھری پڑی ہے۔

(ب) کلام شیخ کو قران کا کشمیری روپ تصوّر کیا جاتا ہے اور تقابلی مطالعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے کلام کا بیش تر حصّہ کلام پاک اور احادیث کا منظوم کشمیری ترجمہ ہے۔

(ج) اپنی نظم "ایک سو تیس سوال وجواب" میں حضرت شیخ نے اگرچہ مسلم اصولِ قانون کو شعری پیرائے میں پیش کیا ہے تاہم فقہ، جغرافیائی تبدیلیوں اور ریاضیاتی تخمینہ پر ان کی دسترس سے ان کی عالمانہ مہارت کی وافر شواہد فراہم ہوتی ہیں۔

(د) ان کی شاعری میں کئی ایسے متصوفانہ بیانات ملتے ہیں جو اس حقیقت کا واضح ثبوت ہیں کہ انھوں نے تصوّف کی مشہور و معروف کتابوں کا مطالعہ کیا تھا۔ ان کی ایک مختصر سی نظم مثال کے طور پر پیش ہے ؎

ابلیس نے گریہ کیا
کہ میں نے تو کافی عبادت کی تھی
لیکن میں کہیں کا نہیں رہا۔
میرے اور منصور کے درمیان یہ امتیاز کیوں ؟
جبکہ ہم دونوں کے پاس ایک ہی راز تھا۔
وہ نادانستہ طور افشائے راز کر گیا اور "انا" کہہ گیا
تو اللہ نے اسے شاباشی دی
لیکن ایک میں ہوں کہ جسے مردود قرار دیا گیا
اب چوروں کی طرح چھپ جانے پر مجبور ہوں
میں اس کا واقفِ راز تھا
اور حقیقت کا شناور
اس نے جب میری تعمیر اسی انداز سے کی
تو بھلا میں اسے کیسے بدلوں ا

منصور نے اپنی مشہور تصنیف "کتاب الطواسین" میں کہا ہے۔ "ابلیس میرا دوست ہے فرعون میرا ساتھی"[1]۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان دو صوفیوں نے ایک ہی طرح کی محسوسات کا اظہار کیا ہے لیکن اس قدر گہری مماثلت جو علامتوں اور طریقہ اظہار میں بھی پائی جاتی ہے، ممکن نہیں اس لیے یہ منطقی امر ہے کہ حضرت شیخؒ نے منصور کے متصوفانہ تجربات میں شریک ہونے کے علاوہ اس کے فلسفے کا بھی مطالعہ کیا ہوگا۔

حضرت شیخؒ کو بدنام کرنے کی تحریک، جو اگرچہ انتہائی ریاکارانہ اور سازشی انداز سے چلائی گئی، ان کی وفات کے بعد بھی جاری رہی۔ شکست خوردہ سازشی کھلے عام سامنے آنے کی ہمت تو نہ کر سکے لیکن انھوں نے اپنے طریقۂ کار میں تبدیلی لائی۔ انھیں احساس تھا کہ حضرت شیخؒ کے خلاف کھلے عام کسی بھی قسم کی غلط بیانی کو برداشت نہیں کیا جائے گا۔ لہٰذا انھوں نے منفی اور مخفی طریقوں سے ان کی شخصیت کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی۔ یہاں پر اس تعلق سے مختصر اشارے پیش ہیں:

۱۔ حضرت شیخ نورالدینؒ کے بارے میں بہت سارا عصری مواد ان کی وفات کے سو سال کے اندر ہی پُر اسرار طور پر غائب ہوا۔ شہیری دَور کی تمام وقائع جات، جن میں ملّا احمد کی "مراۃ الاولیا" اور ان کی تاریخی تصنیف "وقائع کشمیر" نیز ادہمی کی "تذکرۂ اولیائے کشمیر" شامل تھیں، غالباً ضائع کی گئیں۔ اس کے برعکس اس دَور کی سنسکرت وقائع جات کو محفوظ رکھا گیا جن میں حضرت شیخ کے تعلق سے کوئی راست تذکرہ شامل نہیں ہے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنے کی بنیاد فراہم ہوتی ہے کہ مذکورہ فارسی تاریخوں اور تذکروں کو محض حضرت شیخ کے بارے میں صحیح معلومات کو دبا دینے کی غرض سے غائب کر دیا گیا۔

۲۔ ان کی ہر شعری تخلیق کے پسِ منظر کے طور پر عجیب و غریب کہانیاں گڑھ لی گئیں اور ایسا کرتے ہوئے تاریخ کو مسخ کیا گیا۔ سب سے زیادہ ضرر رساں اور بے بنیاد قصّہ وہ ہے جو ان کی "بھونکتا کتّا کہتا ہے، بُو بُو" کے عنوان کی مشہور متصوفانہ نظم کے پسِ منظر کے بطور گڑھ لیا گیا ہے۔ ایسی ہی غلو سازی کی بنیاد پر اٹھارویں صدی کے مورّخ خواجہ اعظم دیدہ مری

---

[1] "کتاب الطواسین" بحوالہ نکلسن "لگیسی آف اسلام" ص ۲۱۷

نے اصل حقائق سے بھی صرف نظر کیا اور حضرت شیخ کی زندگی کے قبل از غارنشینی
ایک شرانگیز خلاصہ پیش کیا۔

۳۔ اسی قسم کے دوسرے من گھڑت قصّے تیار کیے گئے جو ایک تارک الدّنیا
بے عمل سنیاسی کی تصویر پیش کرتے ہیں۔ جبکہ ان کی شاعری اس بات کا تسلّی بخش ثبوت فراہم کرتی
ہے کہ انھوں نے بدی کی قوتوں کے خلاف ایک مجاہد کی طرح لڑا۔

۴۔ حضرت شیخ کی حیات اور شاعری کے بارے میں اگرچہ بہت سی تصانیف لکھی گئیں
لیکن اس قسم کے تمام مسودات چند گھروں نے دبائے رکھے اور تاریخ کے کسی طالب علم
یا محقّق کو ان قیمتی جواہر تک رسائی پانے کی اجازت نہیں دی گئی۔ مسودات کو اس طرح مقفّل کرنے والوں
نے بھی دانستہ یا نادانستہ طور محولہ بالا برسوں پرانی سازش میں اضافہ کر دیا۔

۵۔ نہ صرف یہ کہ ان کی شاعری کا نہایت ہی غلط روپ نیم خواندہ مُلّاؤں نے منبروں
پر پڑھا اور اَن پڑھ گائیکوں نے موسیقی کی محفلوں میں گایا بلکہ اس شاعری کو مسخ بھی کر دیا۔
اسی مسخ شدہ روپ کی بنیاد پر کئی علماء نے اصل کو جاننے یا اس کا سراغ لگانے کی زحمت
کیے بغیر ماضی قریب میں کلام شیخ کی گمراہ کن تنقید و تشریح کی ہے۔ اگرچہ اب
ان میں سے بعض اپنی لاعلمی پر افسوس کا اظہار کرتے ہیں تاہم انھوں نے بھی غیر ارادی طور پر
سازش کا کھیل کھیلا۔

اس صورت حال میں مناسب یہ ہے کہ کارآمد ریکارڈ کا سراغ لگایا جائے اور تخلیق کار اور
مفکر ہر دو اعتبار سے اس عارف شاعر کی تعیّن قدر کی جائے۔

چھ

القاب

کشمیری عوام نے حضرت شیخ کے تئیں اپنی محبت، عقیدت اور خلوص کے پیش نظر انھیں کئی القاب دیے ہیں۔ مثلاً "شیخ العالم" اور "سخی نور الدّین"۔ شاعر کی حیثیت سے انھوں نے "نُند"، "نند ریوش" اور "نُند کیموہ" بطور تخلص استعمال کیا۔ صوفیوں کے لیے وہ "شمس العارفین" ہیں، ہندوؤں کے لیے "سہجانند" (مبارک و مسعود) ہیں اور بحیثیت مجموعی کشمیری عوام کے لیے "علمدار کشمیر"۔

علمدار کشمیر

تیرھویں اور اوائل چودھویں صدی کے دوران ۱۳۲۰ء کے منگول حملے کے نتیجے میں کشمیر کا سماجی و سیاسی شیرازہ بہت حد تک بکھر چکا تھا جس نے کشمیریوں کے دل و دماغ پر گہرے زخم چھوڑے۔

سیاسی استحصال روز کا معمول بن چکا تھا، لوٹ مار اور غارت گری عوام کا مقدّر بن گئی تھی۔ اس پر آفات سماوی مثلاً قحط سالیوں اور سیلابوں نے لوگوں کی کمر توڑ دی تھی۔

اسلامی اثرات پہلے ہی تنگ برفانی دَرّوں میں سے داخل ہو چکے تھے۔ مسلمانوں کی کچھ چھوٹی موٹی بستیاں آباد ہو چکی تھیں لیکن اِدھر اُدھر بکھری ہوئی تھیں۔ یہ یقینی نہیں کہ آیا ان روابط نے مقامی آبادی کی مذہبی سوچ پر کوئی اثر ڈالا۔ تاہم مبلّغین کی سرگرمیاں سہدیو (۱۳۰۱ء — ۱۳۲۰ء) کے دَورِ حکومت میں سید عبدالرحمٰن (شرف الدّین) بلبل شاہ کی کشمیر میں آمد کے ساتھ ہی شروع ہوئیں۔ وہ ایک بلند پایہ صوفی بزرگ تھے اور سہروردی سلسلے کے

ساتھ تعلق رکھتے تھے۔ ان ہی کے اثر کے تحت کشمیر کے بودھ حکمران رینچن نے اسلام قبول کیا کیونکہ وہ بدھ مت کے فلسفہ سے مطمئن نہیں تھا اور ذات پات سے بھری اُس ہندو سوسائٹی کے تئیں تشویش مند تھا جس پر برہمنوں کی اجارہ داری تھی۔ چنانچہ وہ کشمیر کا پہلا مسلمان بادشاہ بن گیا اور اسے سلطان صدرالدین کا خطاب دیا گیا۔ اس نے ۱۳۲۰ء سے ۱۳۲۳ء تک حکومت کی۔ اس کی وفات کے بعد اس کی بیوہ کوٹہ رانی نے پھر سے سیاسی عدم استحکام کی صورت حال پیدا کر دی۔ آخر کار سلطان صدرالدین کا معتبر وزیر شاہ میر (شہمیر) ۱۳۳۹ء میں سلطان شمس الدین کے نام سے تخت پر بیٹھا اور اس نے شہمیری خاندان کی بنیاد ڈالی جس نے دو صدیوں تک کشمیر پر حکومت کی۔

دوسرا اہم واقعہ شہمیر کے پوتے سلطان قطب الدین کے دَورِ حکومت میں رونما ہوا۔ اسلامی دنیا کے ممتاز مبلغ حضرت میر سید علی ہمدانیؒ بالترتیب ۱۳۷۲ء، ۱۳۷۹ء اور ۱۳۸۳ء میں یعنی تین بار کشمیر آئے۔ جب وہ تیسری بار واردِ کشمیر ہوئے تو ان کے ہمراہ ۷۰۰ سادات اور علماء تھے جنھوں نے ملک کے مختلف حصّوں میں اپنی سرگرمیوں کے مراکز قائم کیے۔ امیر کبیرؒ نے کشمیر کے مذہبی ماحول میں انقلاب لایا اور یہاں کی صنعت و حرفت میں نئی نئی ایجادات متعارف کیں۔ انھوں نے کشمیر کو ایک چھوٹا موٹا ایران بنا دیا اور آج تک اسے "ایران صغیر" کہا جاتا ہے۔

۱۳۹۳ء میں حضرت امیرؒ کے فرزند ارجمند، حضرت میر محمدؒ تین سو سادات اور علماء کے ہمراہ کشمیر آئے اور یہاں بارہ سال قیام پذیر رہے۔ انھوں نے اور ان کے ساتھیوں نے وادی کے مختلف علاقوں میں خانقاہیں قائم کیں۔

اس سیلاب نے کشمیری کلچر اور زبان کے لیے زبردست خطرہ پیدا کیا[۱]۔ چنانچہ سادات

---

[۱] فاضل مصنف نے سادات کی سرگرمیوں کے "سیلاب" کو کشمیری زبان اور کلچر کے لیے خطرہ قرار دیا ہے جبکہ اکثر علماء بشمول ناچیز کی رائے میں یہ سرگرمیاں اس لسانی اور ثقافتی منظر نامے کا پیش خیمہ تھیں جن پر خود مصنف بھی زیر نظر کتاب میں جگہ جگہ رطب اللسان ہیں ـــــ مترجم۔

نے مذہبی وعظ و تبلیغ کے ذریعہ اور ملک کی سرکاری زبان کے طور پر اپنی ہی زبان یعنی فارسی کو متعارف کیا۔

ان سادات اور علماء کی اکثریت، بہ استثنائے چند، مخلص مبلغوں، سچے صوفیوں اور انسانیت کے بے غرض خادموں پر مشتمل تھی۔ کئی سادات نے اُن اقدامات کے باعث اپنے وطن کو چھوڑ کر کشمیر میں پناہ لی تھی، جو تیمور نے انھیں کچلنے کے لیے اُٹھائے تھے۔ وہ نمود و نمائش اور دنیاوی رتبہ و مقام کے شوقین تھے، اس لیے انھوں نے کشمیر میں اپنے سابقہ وقار اور مرتبہ کے ساتھ اپنی بازآبادکاری کے لیے کوششیں کیں۔ اس طرح یہ غیر ملکی یہاں اعلیٰ سرکاری عہدوں پر پہنچے اور سیاسی منظر نامے پر چھا گئے۔

ان کی غرض مندیاں بھی ویسی ہی تھیں جیسی کہ مقامی حاکموں اور ذات پات کے حامی برہمنوں کی۔ دونوں کو برتری کا زعم تھا۔ اوّل الذکر کو فارسی زبان و ادب پر قدرت حاصل تھی، تو موخرالذکر سنسکرت کے ماہر تھے۔ دونوں کے لیے مقامی زبان یعنی کشمیری بولنے والا دوسرے درجہ کا شہری تھا۔

مبلّغ سادات نے وادی بھر میں تبلیغی مراکز قائم کیے تھے جہاں وعظ خوانی ان کی مادری زبان میں ہی ہوا کرتی تھی۔

لوگ بڑی تعداد میں ان سادات کے پاس فیض و برکت اور رشد و ہدایت پانے کے لیے جاتے تھے۔ وہ مقامی لوگوں کے ساتھ زیادہ تر فارسی میں ہی گفتگو کرتے تھے اور اس طرح یہ زبان عوامی زندگی پر چھا گئی۔ ساتھ ہی ساتھ اس نے سرکاری زبان کی حیثیت سے سنسکرت کی جگہ لے لی۔ ملازمت کے بھوکے برہمنوں نے فوراً اس زبان کو اپنا لیا۔ دوسری طرف سادھو، سنیاسی اور عام ہندو، سنسکرت یا سنسکرت آمیز کشمیری زبان کے ساتھ مضبوطی سے چپکے رہے۔

اس صورت حال سے کشمیری زبان کو زبردست خطرہ لاحق ہو گیا۔ بدیسی و اجنبی تہذیب نے ساتویں صدی میں مصر میں قبطی (Coptic) زبان کے لیے اس قدر خطرہ پیدا نہیں کیا تھا جس قدر چودھویں صدی میں اس نے کشمیر میں پیدا کیا۔ 'قبطی' جو لوگوں کی مرغوب

زبان تھی اور جسے صدیوں تک فرعونیوں کی سرپرستی حاصل تھی، نسبتاً کمزور حملے کا بھی مقابلہ نہ کرسکی اور اس کی جگہ عربی زبان نے لے لی۔ اس کے برعکس یہاں خطرہ زیادہ شدید تھا کشمیری زبان کو نہ تو کبھی دانشوروں نے تقویت پہنچانے کی کوشش کی تھی اور نہ ہی سیاست دانوں نے۔ لہٰذا فارسی زبان بڑی آسانی سے اس کی جگہ لے سکتی تھی۔ دوسری طرف مقامی مذہبی کٹر پسند سنسکرت زبان کے استعمال پر بڑی سختی کے ساتھ کاربند رہے ہوتے۔ یہ صورت حال لسانی بنیادوں پر کشمیر کی تقسیم کا باعث بن جاتی — یعنی فارسی کا علاقہ مسلمانوں کے لیے اور سنسکرت کا علاقہ ہندوؤں کے لیے۔ اسے شاید مبالغہ آمیز نظریہ تصوّر کیا جائے گا لیکن کم از کم ایسے قومی امکانات تھے جو کشمیری زبان میں ہی سے دو مختلف بولیوں کو جنم دے دیتے۔

اس پس منظر میں یہ حضرت شیخؒ ہی تھے کہ جو اس زبان کے محافظ کی حیثیت سے اُبھرے۔ انھوں نے ایک طرف زبان پر اپنی قدرت کا مظاہرہ کرنے کے لیے سنسکرت آمیز کشمیری نظمیں لکھیں اور دوسری طرف بول چال کی زبان اور ادب کے ساتھ فارسی کو استدلالی طور پر ہم آمیز کیا۔ انھوں نے نہ صرف فارسی کی شعری اصناف متعارف کیں بلکہ فارسی زبان کے قریب استعاروں، ضرب الامثال اور تشبیہات کو وضع کیا یا پھر اسی زبان سے قابلِ قبول الفاظ وتراکیب تک مستعار لیں۔ اس طرح انھوں نے کشمیری زبان کو ختم ہونے سے بچایا، اسے تازہ کار ادبی ہئیتوں سے مالا مال کیا اور اس کے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ کیا۔

للہ عارفہ نے الوہی نغمے مقامی زبان میں گائے تھے لیکن اس زبان کو زمانے کی دست برد سے بچانے کی صلاحیت اس میں نہیں تھی علاوہ ازیں ان اثرات کے سیلاب کو روک لینا کسی بھی شخص کے لیے ناممکن تھا چاہے اس کا مرتبہ کچھ بھی ہوتا۔ اس لیے للہ عارفہ نے حضرت شیخ کی والدہ سے کہا تھا "لے میرے روحانی وارث کی پرورش کر" مشن کو آگے لے جانے اور کشمیر کے ثقافتی ورثہ کو بچانے کے لیے حضرت شیخؒ نے ایک منظم جماعت تشکیل دی۔

دوم، اس بات کی کئی بار وضاحت کی گئی ہے کہ ایرانی کلچر جو نسبتاً زرخیز تھا، یہاں چھا گیا جس سے کشمیر کی تہذیبی روایات کے ختم ہو جانے کا خطرہ تھا۔ حضرت شیخ نے تربیت یافتہ ریشیوں کی ایک جماعت تشکیل دی جس نے مقامی روایات کو بحال رکھا اور ان کی ترویج کی۔

اس سے یہ نتیجہ اخذ نہ کیا جائے کہ ریشی ترقی کے مخالف تھے یا وہ حالت موجود کی قوّتوں کی نمائندگی کرتے تھے یا پھر یہ کہ انھوں نے مبلغین کے بنیادی مقصد کے برعکس کام کیا۔ واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے تازہ وجدید خیالات کو قبول کیا، ان کی اشاعت کی اور وہ طرزِ عمل اختیار کیا جس سے حکومت بھی تمدّنی انقلاب اور قابلِ قبول روایتوں پر اس کے مثبت اثرات کے نتائج کو مستحکم کرنے کی جانب راغب ہوئی۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مبلغین اور ریشیوں کا مشترکہ مقصد تھا اور وہ تھا اسلام کی اشاعت۔ تاہم غیر ملکی مبلغین کی کوششوں سے شعوری یا غیر شعوری طور پر ایرانی یا وسط ایشیائی تمدّن کے اخذ و قبول کے لیے راہ ہموار ہوئی۔ اس لیے ریشی بزرگوں نے جہاں اسلامی روایات کو قائم کرنے کی خاطر مبلغین کے ساتھ مل کر کام کیا وہاں نئے کلچر کے مقامی رنگ وروپ کو بحال رکھنے کے لیے بھی جدوجہد کی۔

سوم، مفاد پرست عناصر کے سیاسی قوّت کے طور پر اُبھرنے سے فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو شدید خطرہ لاحق تھا۔ خود غرض برہمنوں اور مطلب پرست مُلّاؤں، دونوں نے ایک ہوکر مدافعتی قوت۔ کے آلۂ کار کی حیثیت سے کام کیا۔ نتیجے کے طور پر اُن فرقوں کے درمیان تنازعے کی صورت پیدا کی جا رہی تھی جنھیں ایک مشترکہ کلچر ورثہ میں ملا تھا اور جن کے آپس میں گہرے سماجی روابط تھے۔

حضرت شیخؒ خود ایسی قوّتوں کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا پرچار کیا۔ اس نصب العین کے تئیں ان کا والہانہ پن مندرجہ ذیل اشعار سے واضح ہوتا ہے ؎

ایک ہی ماں باپ کے دو بچّوں کے درمیان
یہ نفرت کی آگ کیوں؟

بھلا (اس صورت میں) ہندؤں اور مسلمانوں سے
خدا کیسے اور کیوں کر راضی ہوگا؟

"اللہ مجھے بھی ایسا ہی وردان عطا کر" کے عنوان سے اپنی طویل دعائیہ نظم میں حضرت شیخ نورالدین اسی روحانی مرتبے کی دعا مانگتے ہیں جس سے خدا نے لل دید اور

بھون گاؤں کی گونگی لڑکی یا سدِھ واٹو کو نوازا تھا۔ یہ نظم اس قدر مقبول ہوئی کہ اسے اب تک مسجدوں اور مسلمانوں کی درگاہوں میں عقیدت کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے کشمیر، اسلامی دنیا کا غالباً ایسا واحد خطہ ہے جہاں مسجدوں اور درگاہوں میں ہندو سنتوں کا نام عقیدت و احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔

حضرت شیخؒ کے مریدوں اور ان کی جماعت کے اراکین نے فرقہ وارانہ ہم آہنگی سے معمور، خداترس معاشرے کے لیے ذہنی اور جذباتی بنیادیں تیار کیں۔ بعد میں یہ کشمیری سوچ کی ایک قابل قدر اور مسلّمہ خصوصیت بن گئی اور اس طرح شدید فرقہ وارانہ ہیجان کے دوران بھی کشمیر سیکولر خیالات کی تجربہ گاہ کے بطور اُبھرا۔

ان جملہ حقائق سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت شیخؒ، جو اخلاقی قدروں میں غیر متزلزل یقین رکھتے تھے، کشمیر کے پہلے عوامی رہنما تھے جنھوں نے مقامی اقدار کی بنیاد پر رواداری کا مشترکہ کلچر قائم کیا۔ انھوں نے کشمیری زبان کے چراغ کو گُل ہونے سے بچایا اور اس کے بول چال کا دائرہ وسیع کر دیا۔ انھوں نے اپنی تحریک میں ان اقدار کی نمائندگی کی جو کشمیر سے مخصوص ہیں اور ساتھ ہی کشمیر کی شناخت اور وحدت کو محفوظ رکھا۔ اسی پسِ منظر کے باعث قوم نے ان کے لیے "علمدارِ کشمیر" کا نہایت موزوں اور مناسب خطاب چن لیا۔

یہ خطاب مابعد الطبیعاتی توضیح بھی رکھتا ہے۔ عقیدہ یہ ہے کہ قیامت کے دن حضرت شیخ نورالدینؒ من حیث القوم کشمیریوں کی قیادت کریں گے۔

سہجانند

لفظ 'سہج'، (رحمت و برکت) بدھ مت کے پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ صبر و شکر کا مترادف بن گیا اور اس طرح کشمیر کی مذہبی اور فلسفیانہ فرہنگ میں جگہ پا گیا۔ حضرت شیخ کی ولادت کے وقت اگرچہ بودھ معاشرہ مفلوج ہو چکا تھا، تاہم اس کی تعلیمات کے اثرات ابھی تر و تازہ اور کشمیر کی سماجی اور مذہبی زندگی میں واضح طور پر عیاں تھے۔ حضرت شیخؒ

خود بھی بودھ فلسفے سے متاثر تھے جیسا کہ ان کی عملی زندگی سے ظاہر ہوتا ہے۔ وہ تازہ سبزیوں کے استعمال سے پرہیز کرتے تھے تاکہ کسی جاندار شئے کو نقصان نہ پہنچائیں۔ اس کی بجائے وہ سبزیوں کے گرے ہوئے پتّوں کا ہی شوربہ تیار کرتے تھے۔

"روضتہ الرّیاض" کے چند مسوّدوں میں بابا خلیل نے لکھا ہے کہ حضرت شیخ نے "بودھ حیرت" کے عنوان سے ایک طویل نظم لکھی تھی۔ فاضل مصنّف نے "بودھ حیرت" کا ترجمہ قولِ حکمت کیا ہے۔ بابا خلیل لفظ 'بودھ' (جو کشمیری لفظ ہے) کے لغوی معنی کی وجہ سے غلطی کر گئے تھے جس کا مفہوم "بُدھی" یا "حکمت" ہے۔ دراصل یہ نظم مہاتما بدھ کی مدح میں ہوگی۔ ایک اور دعائیہ نظم میں شاعر نے گوتم بدھ کو یوں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے ؎

اصلی سہج کے سہجانند نے
بے انتہا گیان دھیان کیا
اس نے کال (وقت) اور مال، سب کچھ تیاگ دیا۔
میرے خدا! مجھے بھی ایسا ہی وردان عطا کر۔

بودھ فلسفہ کے زیرِ اثر انھوں نے کئی ایسے الفاظ اور تراکیب کا استعمال کیا جو صرف بدھ مت سے مخصوص تھے اور ایسا ہی ایک لفظ 'سہج' (سہز) ہے، جس کا انھوں نے بالعموم استعمال کیا ہے۔ انھوں نے اس لفظ کے معنیٰ بھی بدل دیئے اور اسے صوفیوں کی لفظیات کا جزو بنایا۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں مدح سرائی کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں ؎

میرے اللہ! تو نے میرے پیغمبرؐ پر
سہج قرآن نازل کر کے
ان کی نظر کو بے پناہ وسعت بخشی

شیومت میں عقیدہ رکھنے کے باوجود کشمیر کے ہندو، مہاتما بدھ کا بڑا احترام کرتے تھے۔ اس لیے انھوں نے حضرت شیخ نورالدینؒ کو گوتم بدھ کا نیا جنم قرار دیا اور محبت و عقیدت کے پیشِ نظر انھیں "سہجانند" کا نام دیا۔ حضرت شیخؒ نے ہندو فرقہ کے لیے محافظ و نجات دہندہ کی حیثیت سے جو کردار ادا کیا اس سے یہ خطاب اور زیادہ مقبول ہوا۔

سات

حضرت شیخؒ کے مُرید

جیسا کہ پہلے ہی کہا جا چکا ہے، حضرت شیخؒ نے سینکڑوں ریشی اپنے مسلک میں داخل کیے اور کارکنوں کی منظم جماعت کے ساتھ ملک بھر میں اس کی بنیادیں مستحکم کر دیں۔ ان اراکین میں مرد اور خواتین دونوں شامل تھے جن میں سے بعض نے کشمیری ادب کی قابلِ ذکر خدمات انجام دیں۔ ان میں سے کچھ اس قدر مشہور ہوئے کہ انھوں نے خود بھی اپنے قائد کے مشن کو آگے لے جانے کے لیے مریدوں کی آزادانہ صفیں بھرتی کیں۔

حضرت شیخ العالمؒ کی وفات کے بعد آپ کے چار ممتاز مریدوں نے یکے بعد دیگرے تحریک کی قیادت کی۔ انھیں خلفائے شیخؒ بھی کہا جاتا ہے۔

بابا بام الدّین

سدرہ ماں کھِے کے چشمے سے گلاب کا دستہ توڑنے کے بعد پیٹ سے رہیں اور نو ماہ بعد حضرت شیخؒ کو جنم دیا۔ سدرہ کے بعد سادھو کی بیوی چشمے پر پہنچی۔ اس نے سوسن کا دستہ توڑا، اس کی خوشبو کو سونگھا، پیٹ سے رہی اور ایک لڑکے کو جنم دیا جو ایک سچا جوگی بنا۔ دنیاداری سے کنارہ کش ہوا اور ضلع اننت ناگ کے علاقۂ مٹن میں واقع بومزو گاؤں کے مقام پر ایک غار میں زاہدانہ زندگی گزاری۔ اس غار کو "آری رائے کا غار" بھی کہا جاتا ہے۔

سادھو کی ولادت سال ۷۷-۱۳۷۶ء میں ہوئی ہوگی۔ یہ معلوم نہیں کہ اس نے اپنی جائے ولادت کھِے جوگی پورہ کو کب چھوڑا، البتہ یہ بات یقینی ہے کہ اس نے اس حد تک

روحانی امتیاز اور کمال حاصل کیا تھا کہ صبح سویرے سورج چڑھنے تک وہ دریائے جہلم کے کنارے پر واقع تمام بڑے مندروں کی نگرانی کرتا تھا۔ ایک طویل ملاقات میں حضرت شیخ اور سادھو نے ایک دوسرے کے سامنے اپنا اپنا مذہبی نقطہ نظر پیش کیا، کشف و کرامات کا مظاہرہ کیا اور ایک دوسرے کے روحانی کمال کو آزمایا۔ آخر کار سادھو حضرت شیخ نورالدینؒ کے حلقۂ مریداں میں شامل ہوا اور مشرّف بہ اسلام ہوا۔ اس سادھو کا نام بام الدین رکھا گیا۔

حضرت شیخؒ کی وفات کے بعد بام الدین نے دو سال تک ریشی تحریک کی قیادت کی۔ وہ بومزو میں اسی غار میں انتقال کر گئے جہاں انھوں نے تفکّر اور ریاضت میں اپنی عمر گزاری تھی اور جہاں ۱۴۳۸ء میں انھوں نے اس تحریک کا مرکزی صدر دفتر قائم کیا تھا۔ ان کی موت ۸۴۴ھ (مطابق ۱۴۴۰ء) میں رمضان کی چودھویں اور پندرھویں تاریخ کی درمیانی شب میں واقع ہوئی۔ ان کے چھوٹے ساتھی حضرت زین الدّین لداخ کے دُور دراز علاقے سے واپس آئے۔ انھوں نے بابا صاحب کی آخری رسومات انجام دیں اور دوبارہ سرحدی علاقے کو روانہ ہوئے۔

بابا بام الدّین کے شاگرد بہت بڑے ریشی تھے جن میں بابا رجب الدّین، بابا شکورالدّینؒ، صبورالدّین، حنیف الدّین اور بابا شمس الدّین شامل تھے۔ بابا بام الدّین سے کشمیری میں بعض اشعار منسوب ہیں تاہم ان کی شاعرانہ حیثیت برائے نام ہے۔

حضرت زین الدّین ولیؒ

ذکر ہو چکا ہے کہ کشتواڑ کے پالمد علاقے کے زَے سنگھ (جے سنگھ) کن حالات میں حضرت شیخ کے دائرۂ اثر میں آگئے، مشرّف بہ اسلام ہوئے، زین الدّین کہلائے اور انھیں دچھن پرگنہ میں ایک خود مختار ریشی مرکز کے اختیارات سونپے گئے۔ وہ جگہ (جہاں یہ مرکز تھا) عیش کہلاتی تھی جو اب عیش مقام کے نام سے جانی جاتی ہے۔

اس امر کا بھی ذکر ہو چکا ہے کہ سلطان زین العابدین کے حکم کے تحت حضرت زین الدّین وادی بدر ہو گئے اور انھوں نے تبّت میں مارے مارے پھرتے ہوئے جلاوطنی کے دو سال

گزارے ۔بام الدّین کی وفات کے بعد ریشیوں نے ان کی خلافت کا اعلان کر دیا ۔ چنانچہ سلطان نے ، نتائج کا خیال کرتے ہوئے ، جلا وطنی کا حکم منسوخ کرنے کے فوری اقدامات اٹھائے اور انھیں واپس بُلانے کا فرمان جاری کیا۔ عوام اور حکومت دونوں کی جانب سے ان کا گرم جوشی کے ساتھ استقبال کیا گیا ۔ انھوں نے ۱۴۴۰ء میں خلافت کا منصب سنبھالا ۔ اپنی جلا وطنی کے دِنوں کے تجربات بیان کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں ؎

زمہریر میں اپنے سُن ہاتھوں کو
میں نے اپنی سانسوں کی حرارت سے گرم کیا۔
تپتے ہوئے خشک صحرا میں پیاس بُجھانے کے لیے
مجھے ہونٹوں کو زبان سے تر کرنا پڑا
شدید سردی میں میرے کان یخ بن گئے
ریشی کا لقب پانے کے لیے
ہم نے اپنے وطن چھوڑ دیئے
نشیب و فراز دیکھے اور مشکلات کا سامنا کیا
ہم ریشیوں کے بُرے دن آنے والے ہیں۔

آٹھ سال تک سرگرمی اور تن دہی کے ساتھ تحریک کی قیادت کرنے کے بعد زین الدّین ولیؒ ۸۵۲ھ (مطابق ۱۴۴۸ء) میں وفات پا گئے ۔ اپنی وفات سے قبل انھوں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ کوئی ان کے غار میں داخل نہ ہو ۔ چنانچہ تیسرے روز جب ان کے مرید غار کے اندر داخل ہو گئے تو انھوں نے وہاں نہ بابا زین الدین کی نعش دیکھی اور نہ ہی تدفین کی کوئی نشانی ۔ مریدوں نے زار و قطار رویا اور تاریک غار کے اندر ادر باہر ، ہر جگہ ان کی تلاش کی ۔ بالآخر بابا نے اپنے ایک مرید کو خواب میں اپنی قبر کا پتہ بتایا اور اس طرح ایک خاص جگہ کی نشاندہی ہوئی جہاں ایک آستان تعمیر کیا گیا ۔

ان کے مریدوں میں بابا شمس الدین ، بامی ریشی اور دریا دین مشہور ہیں ۔ بابا زین الدینؒ نے اگرچہ کچھ ہی اشلوک کہے ہیں لیکن فکر اور فن ہر دو اعتبار سے یہ عمدہ شعر پارے ہیں۔

بابا لطیف الدّین

ریشی تحریک کے تیسرے خلیفہ بابا لطیف الدّین، مڈیو وڈوَن کی چھوٹی سی ریاست کے حکمران تھے۔ وہ مختہ پکھری کے مقام پر حضرت شیخ سے متاثر ہوئے۔ ان کی قسمت میں سلطنت کو چھوڑ کر تیسرے خلیفہ کی حیثیت سے عوام کے دلوں پر حکومت کرنا تھا، اس لیے حضرت شیخؒ سے ان کی یہ ملاقات بڑھ کر گہری دوستی میں بدل گئی۔ بالآخر لڈی رینہ (لطیف الدّین) نے اپنی سلطنت چھوڑ دی، اسلام قبول کیا اور حضرت شیخ کی خدمت گزاری میں رہنے لگے۔ بابا زین الدینؒ کی وفات کے بعد تحریک کی قیادت انھیں سونپی گئی۔ انھوں نے تحریک کی رہنمائی و قیادت وترہ ہلؔ[1] اور پوشکرؔ[2] میں خود اپنے ہی مرکزوں سے کی۔ ان کی وفات پوشکر میں ہوئی جہاں یہ وہ مدفون ہیں اور جہاں ان کا آستان مرجع خاص و عام ہے۔ ان کے کئی مریدوں نے بھی شہرت اور قبول عام پایا۔

بابا نصر الدینؒ

وودّر (مضبوط)، جیساکہ ان کا اصل نام تھا، جوانی میں معدے کے شدید عارضے میں مبتلا تھے۔ اس تکلیف نے انھیں حضرت شیخؒ سے فیضیاب ہونے کے لیے ان کے غار میں لایا۔ چنانچہ وہ بعد میں صحت یاب ہوئے اور حضرت شیخؒ کی خدمت میں رہے۔ انھوں نے بڑے جوش و جذبے کے ساتھ اپنے مشفق و ناصح کی خدمت کی۔ حضرت شیخؒ حضرت بابا نصر کی لمحہ بھر کی جدائی بھی برداشت نہیں کرتے تھے۔ حضرت شیخ اپنے بیش تر اشعار میں ان ہی سے مخاطب ہیں۔ چنانچہ شیخ العالمؒ کی وفات کے بعد بابا نصر نے چرار میں ان کے صدر دفتر کا انتظام سنبھالا۔ اگرچہ وہ حقیقت میں اس تحریک کے قاید تھے لیکن انھوں نے خود بام الدّین، زین الدّین اور لطیف الدّین کو اپنے پیش روؤں کی حیثیت سے نامزد کر دیا اور خود قیادت کی باگ ڈور ان تین بزرگ ساتھیوں کی وفات کے بعد ہی سنبھالی۔

---

[1] اور [2] یہ دونوں گاؤں وادیٔ کشمیر کے بڈگام ضلع میں واقع ہیں۔

بابا نصر کی وفات کے بعد تحریک کی قیادت ان کے مریدوں کو منتقل ہو گئی اور چرار کے بنیادی ریشی مرکز کا انتظام، جس میں حضرت شیخ کی درگاہ کا نظم و نسق بھی شامل تھا، بابا نصر کے ہی ریشی سلسلہ کے تحت رہا۔

بابا نصر ایک اچھے شاعر تھے۔ ان کا کلام ریشی ناموں میں درج ہے۔ یہ بابا نصر ہی تھے جنھوں نے کشمیری میں قطعہ تاریخ لکھنے کا شعری طریقہ متعارف کیا۔ اس طرح کا پہلا قطعہ انھوں نے حضرت شیخ کی وفات پر کہا۔ قطعہ (جس صورت میں اب یہ دستیاب ہے) کے آخری مصرعے سے حضرت شیخؒ کا سال وفات نکلتا ہے۔

بابا نصر نے ۱۴۵۱ء میں وفات پائی اور انھیں اُسی آستان میں دفن کیا گیا جہاں ان کے مرشد مدفون ہیں۔ بابا کے اشلوکوں کی خاص تعداد نور ناموں میں محفوظ ہے لیکن ان میں سے بعض ان کے مرشد کے اشعار سے خلط ملط ہوئے ہیں۔ انھوں نے اپنے مرشد کے ہی اسلوب میں شعر کہے جو حکیمانہ خیالات سے مملو ہیں۔

سادگی اور روانی ان کے کلام کی بنیادی خصوصیات ہیں۔ کچھ نمونے ملاحظہ ہوں ؎

وہ بوڑھا کہ جس کے دانت نہ ہوں، اخروٹ کا کیا کرے گا؟
نامرد اور ناتواں شخص تیر و کمان کا کیا کرے گا؟
کُتّے کی گردن میں موتیوں کا ہار کس کام کا؟
اور اندھے کے لیے خوبصورت عورت کی کشش کے کیا معنی؟

میں اپنے ہاتھ پیر سے مانگوں گا
کہ جو میری خواہش پوری کریں گے
لیکن افسوس کہ جب یہ حکم کی تعمیل کرنا بند کر دیں گے
تب میں کس سے مانگوں گا، کون دے گا مجھے!

امتیاز کا تاج دین دار شخص کے سر کو ہی زیب دیتا ہے

جو ذکرِ حق کے ساتھ ساتھ فکرِ عیال بھی کرتا ہے۔

ہمارے پیغمبرؐ سب کے پیارے ہیں
اللہ کے تئیں اپنے خلوص کے باوجود
آپؐ نے عمل سے بھرپور سماجی زندگی گزاری۔
جو شخص خالصتاً سماجی و مادّی زندگی گزارتا ہے
وہی ابدی عشق کی منزلِ مقصود تک پہنچ پائے گا۔

حضرت شیخؒ نے اپنے ایک 'شروک' میں اپنے چار مریدانِ باصفا کی تعریف اس طرح کی ہے ؎

بام الدّین، نصر الدّین اور بابا زین الدّین
اور وفادار لطیف الدّین
اللہ نے مجھے چار ہیرے بخشے ہیں
جنھیں میں نے ایک ہی مالا میں پرویا ہے،
یہ میرے ہیں اور میں ان کا ہوں۔

ایک اور جگہ وہ بام الدّین کے بارے میں لکھتے ہیں ؎

بامزو گاؤں کا بہ سادھو
جس نے اپنی زندگی بتوں کی پوجا میں گزاری
میرے خدا! تم اسے اپنی راہ پر لے آئے
مجھے بھی ایسا ہی وردان عطا کر

بابا زین الدّین کے بارے میں اس نظم میں کہتے ہیں ؎

میرا زُیہ ہِ زین (الدین) سرچشمۂ آبِ حیات ہے
اس نے اللہ کی اس قدر عبادت کی
کہ شاگرد اُستاد سے آگے نکل گیا
اے اللہ، مجھے بھی ایسا ہی وردان عطا کر

حضرت شیخؒ کے مریدوں میں سیّد غلام الدّین اور سیّد علی بلخی (جو بکھر پورہ میں مدفون۔

ہیں) جیسے غیر ملکی بھی شامل تھے۔ مقامی علماء میں شریف آشور، ملاّ پیر بار اور قاضی صدرالدینؒ آپ کے مرید بنے۔ اہم ترین سادھوؤں میں سے بابا بام الدین کے علاوہ کتی پنڈت (قطب الدین) اور زلی ریبنہ جیسے علماء آپ کے سلسلے میں شامل ہوئے۔

حضرت شیخ العالم کی خاتون مریدوں میں سے تین نے بڑی شہرت پائی۔ شیام ماجی، لل عارفہ کے بعد کشمیر کی دوسری بڑی شاعرہ ہے۔ انھوں نے کشمیری میں پہلا مرثیہ لکھا۔ اپنے محبوب مرشد کی وفات کے بعد، اُن کی جدائی میں شیام ماجی نے جو اشعار کہے وہ سوز و گداز، تشبیہات و استعارات کے استعمال اور مواد و مضمون کے اعتبار سے صنفِ غزل کے بہت قریب ہیں۔

دو اور خاتون مریدوں، دوہت دید اور بہت دید نے 'زالس' کے مقام پر حضرت شیخ اور سید میر محمد ہمدانیؒ کے مابین روحانی مناظرہ میں عملی طور پر شرکت کی۔

قومی ہیرو

حضرت شیخ نورالدینؒ کو اپنی حیات میں اور اس کے بعد جو شہرت ملی وہ قومی ہیرو کا ہی حصّہ ہے۔ ان کی ہمہ جہت شخصیت کے ساتھ سبھی مذاہب اور طبقوں کے لوگ محبت کرتے تھے۔ کشمیری، من حیث القوم، آپ کو علمدار کشمیر مانتے ہیں۔ مسلمان خاص طور پر آپ کو شیخ العالم کہتے ہیں اور ہندوؤں کے لیے آپ سہجا نند ہیں۔ چنانچہ وہ شعیہ فسادات بھی جو چک دَور میں روز کا معمول بن چکے تھے، فریقین میں حضرت شیخ کی بے پناہ مقبولیت پر اثر انداز نہیں ہوئے۔ یہ شعیہ بادشاہ سلطان علی شاہ چک (۱۵۷۰ـ ۷۸ء) ہی تھا جس نے ان کے آستان عالیہ کے اردگرد دیودار کی کندہ کی ہوئی لکڑی سے شاندار برآمدہ بنوایا۔

روایت ہے کہ سدرہ ماجی جب امید سے تھیں تو انھوں نے حضرت شاہ ہمدانؒ سے تکلیف کی شکایت کی جو انھیں نماز کے لیے جھکتے وقت پیٹ میں محسوس ہوتی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ شاہِ ہمدانؒ نے انھیں مشرق کی جانب منہ کرکے نماز پڑھنے کا مشورہ دیا کیونکہ ان کے پیٹ میں (پرورش پانے والا) بچّہ بھی پانچوں وقت باقاعدگی کے ساتھ نماز ادا کرتا تھا۔ سدرہ ۱۳۷۶ـ ۷۷ء میں امیدؔ سے تھیں جبکہ حقائق کے مطابق شاہِ ہمدانؒ اس زمانے میں کشمیر میں نہیں تھے۔ لہٰذا اس طرح کے واقعات محض اسطور کا حصّہ ہیں۔

اس طرح سے کئی قصّے ان کی زندگی سے منسوب ہیں لیکن وہ یا تو اسطور کا حصّہ ہیں یا پھر لوک نوعیت کے ہیں۔ حضرت شیخؒ کے تئیں عوام کو جو عقیدت و محبت تھی اس کے پیش نظر وہ فوک لور کے محور بن گئے۔ وہ غالباً ایسے واحد شخص ہیں کہ جنھیں کسی نہ کسی شکل میں بیش تر کشمیری فوک لور کے مرکز کی حیثیت حاصل ہے۔

"زہنہ نامہ" (تولد نامہ) ایک طویل لوک گیت ہے جو حضرت شیخ کے قبل از پیدائش اور بعد از پیدائش کے کشف و کرامات بیان کرتا ہے۔ "ژرار بر لسوار" (چرار شریف میں جمعرات کا میلہ) کا اثر کشمیری فوک لور کا ایک اور مقبول موضوع ہے۔

حضرت شیخؒ کا کلام کشمیر کی جملہ سماجی و مذہبی فضا پر اپنا اثر رکھتا ہے۔ گایک موسیقی کی سنگتوں کا آغاز ان کے اشلوکوں سے کرتے ہیں، مذہبی مبلغ منبروں پر اور لیڈر سیاسی پلیٹ فارم پر آپ کے اشعار پڑھتے ہیں۔ ضروریات زندگی کی بڑھتی ہوئی قیمتوں سے پریشان گھریلو عورت ان کا یہ شعر دہراتی ہے ؎

ایندھن چندن کی طرح کم یاب ہوگا
نمک، چینی سے بھی بیش قیمت ہوگا
اور کھانے کا تیل عطر سے بھی مہنگا ہوگا

نیک سیرت خاتون معاشرے میں پائی جانے والی بداخلاقی سے تنگ آکر دکھ اور اندوہ میں اپنے ہیرو کا حکیمانہ قول پیش کرتی ہے ؎

آنے والے دنوں کے تیور ہی کچھ اور ہوں گے
موسم خزاں کے پھل بہار کے پھلوں کے ساتھ ہی پک جائیں گے
ماں اور بیٹی ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر گھر سے نکلیں گی
اور دن رات غیروں کے ساتھ گزاریں گی

نام نہاد عوامی حکمرانوں سے مایوس ہونے والے لوگ وہی بات دہراتے ہیں جو حضرت شیخؒ نے پانچ سو سال پہلے برمحل کہی تھی ؎

سرچشمے سوکھ جائیں گے
پرنالے لبالب بہیں گے
اور پھر ملک پر بندروں کا راج ہوگا

کشمیری زبان کے کسی محاورے یا حکیمانہ قول کا جب بھی حوالہ دیا جاتا ہے تو ان کی تخلیق حضرت شیخؒ سے منسوب کی جاتی ہے۔ اگرچہ متعدد محاورے ان کے اشعار سے

ماخوذ ہیں اور اسی حیثیت سے وضع کیے گئے ہیں تاہم سبھی ایسے نہیں ہیں۔ لیکن اس سے ان کی شخصیت کے اثرات کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ جو بھی لیڈر، مبلغ یا مصلح انقلابی یا اصلاحی اقدامات اٹھانے کے لیے سامنے آجائے اسے لازماً حضرت شیخؒ کی چھتر چھایا کے نیچے پناہ لینی ہے۔

انیسویں صدی میں کشمیر کے مسلمان معاشرے میں حد سے زیادہ آستان پرست ذہنیت داخل ہوگئی۔ مصلح اور راسخ العقیدہ مذہبی مبلغوں نے تاہم ایسے کاموں میں انتہا پسندی کی کڑی تنقید کی۔ یہاں تک کہ انھوں نے ایسی حرکتوں کو بت پرستی قرار دیا۔ اپنے نقطۂ نظر کو عام کرنے کے لیے انھوں نے حضرت شیخ کے اشلوک کے طرز پر ایک مقولہ وضع کیا اور اسے حضرت شیخ سے منسوب کیا ؎

موٚ کر استانہٕ استانہٕ   کرِتھ یہ کوٚر استانہٕ وانٚ

(آستان پرستی مت کر، وہی کر جو خود آستان والے نے کیا۔)

بعض شعیوں نے حضرت شیخؒ کے طرز پر یہ مصرعہ گڑھ لیا اور اسے ان سے منسوب کیا ؎

آلن ترٚاوِتھ والن نمن

(وہ آلِ پیغمبرؐ کو بھول جائیں گے اور محض تبرّکات (موئے مبارک وغیرہ) کی عبادت کریں گے)

۱۹۳۱ء میں جب شیخ عبداللہ نے مطلق العنان ڈوگرہ مہاراجہ کے ظلم و جبر کو للکارا تو لوگوں نے ان کی جرأت کو معجزاتی سمجھا اور ان کی شخصیت کے تئیں عقیدت کو ظاہر کرنے کے لیے نند ریشی کے اسلوب اور طرز پر ایک شعر گڑھ لیا جسے آج بھی شیخ نورالدینؒ کے ساتھ منسوب کیا جاتا ہے۔ شعر یوں ہے ؎

زینہٕ گیر آب پھیرِ   صوٚرہِ منز لال نیرِ

(جس وقت زینہ گیر علاقہ سیراب ہوجائے گا، عین اسی وقت صورہ میں سے ایک ہیرا چمکے گا)

صورہ مرحوم شیخ عبداللہ کی جائے پیدائش ہے۔ کہا جاتا تھا کہ بارہمولہ کے زینہ گیر علاقہ کو آبپاشی کی سہولیات ان ہی دنوں فراہم کی گئیں جب مذکورہ لیڈر کی پیدائش ہوئی۔

کشمیر کے کسی دوسرے عارف، بادشاہ، عالم یا سیاست دان نے قومی سطح پر

اس قدر خراج تحسین نہیں پایا جس قدر حضرت شیخ کو ملا۔ محض ان کی شخصیت اور تحریک پر فارسی میں کتابوں کی کتابیں تصنیف کی گئیں۔ کشمیر کے شعرائے متاخرین نے حضرت شیخ کی مدح میں سینکڑوں نظمیں لکھیں۔ انھوں نے موضوعاتی سطح پر بھی ان کے کلام کی تقلید کی۔ شاعری کے میدان میں حضرت شیخ کے جانشینوں نے ان کے طرزِ اسلوب میں متعدد تخلیقات نظم کیں۔

جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے، مرزا حیدر اور شہنشاہ اکبر نے اپنی اپنی حکومتوں کو استحکام بخشنے کے لیے اپنی جارحانہ کارروائیوں کو حضرت شیخ کی " روحانی خواہشات سے منسوب کیا۔ دونوں نے یہ کہانیاں گڑھ لیں کہ انھوں نے خواب میں ایک درویش صفت کو دیکھا جس نے اپنا نام نورالدّین بتایا اور یہ ہدایت کی کہ میری قوم کو فرقہ وارانہ حکمرانی سے بچاؤ۔ دو افغان گورنروں لالہ سکھ جیون مل اور عطا محمد خان نے بھی حضرت شیخ کی مقبولیت کا فائدہ اُٹھا کر انقطاع کی کارروائیوں کے لیے عوام سے حمایت حاصل کی، یہاں تک کہ موخرالذکر نے ان کے نام کے سکّے بھی بنوائے۔

حضرت شیخؒ کشمیر کی پہلی ایسی برگزیدہ شخصیت ہیں جس کی چھٹی صد سالہ تقریبات عوامی اور سرکاری دونوں سطحوں پر منائی گئیں۔

حضرت شیخؒ نے زندگی میں تین مرتبہ کشمیر بھر کا دورہ کیا اور بعض پرگنوں اور دیہات کے بارے میں مخصوص تاثرات کا اظہار کیا۔ ان کے یہ اقوال" فوک" کے اس قدر قریب ہیں کہ اپنی قدامت کے باوجود اب تک تازہ معلوم ہوتے ہیں اور آج بھی برمحل اور موزون خیال کیے جاتے ہیں۔ اگرچہ ان تاثرات میں بعض جگہوں کے باشندوں کے تعلق سے کڑی تنقید بھی شامل ہے پھر بھی متعلقہ لوگ اپنے ہیرو کی ایسی کہاوتوں پر فخر محسوس کرتے ہیں۔

اس بات کا بھی ذکر ہو چکا ہے کہ کشمیر میں ہر دوسرے گاؤں میں اس سرزمین کے مایہ ناز سپوت کی کوئی نہ کوئی یادگار یا کوئی نہ کوئی آستان ہے۔ مزید برآں تقریباً ہر گاؤں میں لوگ کسی چشمے، چنار کے کسی پیڑ یا کسی اونچے ٹیلے کو حضرت شیخؒ کی یاد سے جوڑتے ہیں۔ کئی

غاروں کو اس لیے مقدس قرار دیا جاتا ہے کہ وہاں حضرت شیخ نے تفکّر کیا ہے۔ چنانچہ ان کے والدین، بیوی بچوں، سسر اور بہنوئیوں کی قبروں پر بھی آستان تعمیر کیے گئے ہیں۔ یہاں تک کہ اس حجّام کی قبر پر بھی ایک یادگار کھڑی ہوئی ہے جو حضرت شیخؒ کے سر کی حجامت کیا کرتا تھا۔ ریاست کے محکمۂ جنگلات نے جنگلوں کے سرمایے کے تحفّظ میں معاونت کے بطور حضرت شیخؒ کے اس مصرعہ کو اپنے اصولِ عمل (ماٹو) کی حیثیت سے اختیار کیا ہے۔ ع

اَن پوشہِ ، وَن پوشہِ

(جب تک ہیں بَن، تب تک ہے اَن)

سابق وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے محولہ بالا مصرعے کا حوالہ اپنی اُس تقریر میں دیا جو انھوں نے ۱۹۸۰ء میں اٹلی میں کی۔ حضرت شیخؒ کا درج ذیل مصرعہ ہر عدالت کے دروازے پر کندہ کرنے کی ضرورت ہے ع

کریہ کھوتہِ بوڈ انصاف

(انصاف عبادت سے افضل ہے)

حضرت شیخؒ بحیثیت شاعر

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ حضرت شیخؒ کشمیری زبان کے محافظ تھے اور انھوں نے اس کی ادبی سرگرمیوں کے نئے افق روشن کیے۔ انھوں نے اس میں نئی ترکیبوں اور استعاروں کا اضافہ کیا، اس کے مقامی رنگ اور سنسکرت کے ذائقہ کو بحال رکھا لیکن ساتھ ہی مہارت کے ساتھ اسے فارسی ادب کی لطیف خوشبو سے ہم آمیز بھی کیا۔ انھوں نے اس میں فارسی تشبیہات اور علامتوں کا موزون استعمال کیا، فارسی عروض کے اوزان اپنائے اور زرخیز فارسی ادب کے شعری محاسن متعارف کیے۔

مرحوم عبدالاحد آزادؔ[1] (۱۹۰۳ء — ۱۹۴۸ء) نے بجا طور پر کہا ہے کہ" لل عارفہ اور حضرت شیخؒ کی شاعری کو ایک ادبی دور کا نقطۂ آغاز قرار نہیں دیا جانا چاہیے بلکہ اعلیٰ ادبی روایات کا پختہ ماحصل سمجھنا چاہیے"۔ تاہم انھیں بھی کلام شیخؒ تک بہت کم رسائی تھی کیونکہ نورناموں کے مسودات چرار کے مجاوروں اور دیگر پیرخاندانوں نے حسد کے جذبے کے تحت اپنی تحویل میں رکھے تھے۔ بابا نصیبؒ جنھیں عربی اور فارسی، دونوں زبانوں کے متصوفانہ ادب کا گہرا مطالعہ تھا، کو جس قدر سکونِ قلب اور طمانیت کلام شیخؒ کے مطالعہ سے حاصل ہوتی تھی کسی اور کتاب سے نہیں ملتی تھی۔

"اسرار الابرار[2]"، کے مصنّف حضرت بابا مشکواتیؒ اپنے پیرومرشد حضرت بابا نصیبؒ پر کلام شیخؒ کے اثرات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ" جب انھیں (بابا نصیبؒ کو) حضرت شیخؒ کا کلام یا

---

[1] کشمیری زبان اور شاعری (اردو)　　[2] ذاتی مسودہ

ان کے کچھ اشعار سننے کا موقعہ ملتا تو وہ بے حد متاثر ہوتے اور اس قدر زار و قطار روتے کہ آنسوؤں سے ان کا گریباں بھیگ جاتا ۔"

لل عارفہ اور شیخ العالمؒ سے پہلے "واکھ" اور " وژن " دو خاص شعری اصناف تھیں۔ ان دونوں اصناف کا ذکر لل کے ایک واکھ میں ملتا ہے ۔ لل عارفہ نے اپنے داخلی عارفانہ تجربوں کا اظہار واکھ کی صنف میں کیا جو اپنے اختصار اور جامعیت کے اعتبار سے پیچیدہ تجربات و محسوسات کے اظہار کے لیے موزون صنف تھی ۔ دوسری طرف حضرت شیخؒ کے لیے شاعری محض تجربات و احساسات کا وسیلۂ اظہار نہیں تھی بلکہ شاعر کے نقطۂ نظر کو قارئین یا سامعین تک پہنچانے اور ذہن نشین کرانے کا ذریعہ بھی تھی حضرت شیخ العالمؒ نظریاتی شاعر تھے اور اپنے مقصد کے تئیں کمیٹڈ تھے ۔ ان کے یہاں ان کا مشن بنیادی اہمیت کا حامل تھا اور شعری حسن کا درجہ ثانوی تھا ۔ توحید اور اللہ کے حاظر و ناظر ہونے کا پرچار ان کا عزیز ترین اصول تھا ۔ نفرت ، حسد ، حرص و ہوس ، شہوانیت اور غصّے کو قابو میں کرنا آپ کے ضابطے کا لب لباب تھا ۔ انسانی اقدار کی تنظیم ، جانداروں کی حفاظت اور اس بات پر غیر متزلزل ایمان کہ آخرت میں ہم سب اپنے اعمال کے لیے جواب دہ ہوں گے ، ایسے اصول تھے جو آپ کو کسی بھی چیز سے زیادہ عزیز تھے ۔

ان ہی اصولوں کے لیے آپ سماجی تعلقات سے دست بردار ہوئے تھے ۔ دنیاوی عیش و عشرت کو ترک کیا تھا اور خود کو دکھ درد ، نشیب و فراز اور بھوک اور پیاس کی دنیا میں دھکیل دیا تھا ۔ جو شخص ان بلند اصولوں کے لیے اپنی ساری زندگی وقف کردے وہ محض اپنی یا اوروں کی خوشی کے لیے ہی شعر نہیں کہہ سکتا ۔

اس طرح حضرت شیخؒ خود کو واکھ جیسی نسبتاً چھوٹی صنف تک محدود نہ رکھ سکے بلکہ اپنی بیش تر شاعری انھوں نے ' وژن ' کی صنف میں کی ۔ علاوہ ازیں انھوں نے ایسی متعدد نظمیں لکھیں جو مواد اور ہیئت ، دونوں اعتبار سے جدید دکھائی دیتی ہیں ۔ انھوں نے قطعات بھی کہے اور ان کے بعض اشعار مثنوی کی ہیئت میں بھی ہیں ۔

کلام شیخؒ کو "شرک" ، کہا جاتا ہے جو (سنسکرت) لفظ شلوک کا کشمیری روپ ہے اور

جس کے معنی حکیمانہ اقوال کے ہیں۔ بدقسمتی سے حالیہ دور میں "شرک" کو واکھ یا قطعہ جیسی شعری ہیئتوں کے ساتھ ملا یا گیا ہے جو صحیح نہیں ہے۔ "شرک" کو ایک علیٰحدہ شعری ہیئت نہیں سمجھنا چاہیے۔ اس میں حضرت شیخ کا سارا کلام شامل ہے وہ جس بھی ہیئت یا صنف میں ہے۔

حضرت شیخؒ نے خود لفظ "شلوک"، یا "شرک"، حدیث کے لیے استعمال کیا ہے ؎

کن تھاوُ شرکن بیہ قرآنس

تی بایہ گژی پانس سیتھ

(قرآن اور حدیث پر کان دھر، تمہاری نجات اسی میں ہے۔[1])

کشمیری میں اسلامی فقہ کی اصطلاحات گہرے طور پر داخل ہونے کے ساتھ ساتھ لفظ "حدیث" اس زبان میں رواج پاگیا۔ نتیجہ کے طور پر 'حدیث' کے معنوں میں 'شرک' کا استعمال متروک ہوگیا اور اس کی بجائے یہ لفظ حضرت شیخؒ کے حکیمانہ اقوال کے لیے ہی استعمال کیا جانے لگا۔

تذکرہ نگاروں نے "شرک" کو "شوک" کا نام دیا ہے جس کے معنی کراہنے یا ماتم کرنے کے ہیں۔ بہرحال، اس کے معنی جو بھی ہوں، یہ اصطلاح تکنیکی ہونے کی بجائے تصوّراتی ہے۔ اس لیے اس سے بلالحاظ ہیئت وصنف، حضرت شیخ کے تمام کلام کی شناخت ہوتی ہے۔

"وَژُن"، کشمیری شاعری کی سب سے پرانی صنف ہے۔ اگرچہ ہمارے پاس حضرت شیخؒ کے قبل کے 'وژُن' کا کوئی نمونہ نہیں ہے تاہم ان کی شاعری اور للہ عارفہ کے کلام، دونوں سے مستنبط ہوتا ہے کہ یہ صنف اس سے پہلے رائج رہی ہے۔ یہ معلوم نہیں کہ حضرت شیخ العالمؒ سے پہلے وژُن کی کیا صورت تھی۔ سب سے اولین دستیاب نمونہ خود ان کی شاعری ہے۔ ان کے وژنوں اور بعد میں اس ہیئت میں تخلیق کیے ہوئے شعرپاروں کے مطالعے سے اس صنف کی درج ذیل

---

[1] اس مونوگراف میں کلام شیخ العالمؒ کے اردو ترجمے میں مصنف کے انگریزی ترجمہ کے ساتھ ساتھ اصل کشمیری کلام کو بھی زیرنظر رکھا گیا ہے اور اکثر موقعوں پر موخرالذکر کو ہی ترجیح دی گئی ہے۔ ترجمہ اگرچہ نثری ہے لیکن کوشش یہ رہی ہے کہ موضوع، مضمون اور شعری حسن ممکنہ حد تک سامنے آسکے ـــــ مترجم۔

خصوصیات سامنے آتی ہیں :—

(ا) یہ ایک طویل نظم ہوتی ہے جو یا تو موضوع کے اعتبار سے مسلسل ہوتی ہے یا پھر اس کے ہر بند میں الگ الگ موضوع یا خیال پیش ہوتا ہے۔

(ب) ہر بند چھوٹی بحر کے چار مصرعوں پر مشتمل ہوتا ہے اور ہر بند کا چوتھا مصرعہ ٹیپ کا ہوتا ہے۔

(ج) یہ صنف، گیت اور غزل دونوں کے بہت قریب ہے۔ اپنے مواد، روانی اور لفظیات میں اگر "وژن" سادہ خیالات کا اظہار کرے اور لوک نغمے کے قریب آجائے تو یہ خالصتاً گیت ہے۔ لیکن جب "وژن" میں نالہ ہائے فراق، انسانی فطرت کی پیچیدگیاں، مقصدِ حیات، انسان کی اصل منزلِ مقصود، خالق و مخلوق کے رشتے اور اس طرح کے بلند خیالات پیش ہوتے ہیں تو یہ غزل کے دائرے میں آتا ہے۔

جب حضرت شیخؒ کے وژن کے موضوع اور اس کی ہئیت پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے بیش تر عارفانہ نغمے ہیں جن میں موضوعاتی تسلسل پایا جاتا ہے لیکن ان میں ایک اچھی تعداد ایسے 'وژنوں' کی ہے جو ہماری ابتدائی غزلوں کے نمونے کہے جاسکتے ہیں۔ "گونگل نامہ" اس کی مثال ہے۔ اس مسلسل غزل میں شاعر نے علامتوں کا ہنرمندانہ استعمال کیا ہے مثلاً زمین جوتنا، بیج بونا، نلائی کرنا، فصل کاٹنا، اناج کو الگ کرنا اور اس کی ڈھیریاں بنانا اور اس طرح کے دوسرے معاون امور جو کسان کو اس وقت تک انجام دینے ہوتے ہیں جب تک کہ زمیندار کے کارندے آجائیں۔ اناج کو بھوسے سے الگ کریں، بیش تر اناج ذخیرہ کرلیں اور گودام کے دروازے مقفّل کرلیں۔ زراعت کے پیشہ سے مستعار یہ تمام الفاظ اپنے لغوی اور استعاراتی مفہوم سے زیادہ معنی خیز ہیں۔ ان میں سے ہر ایک لفظ کثیر المعنویت کا حامل ہے۔ (مذکورہ غزل مسلسل میں) چوتھا مصرعہ ٹیپ کی حیثیت سے ہر بند کے آخر پر مکرر آتا ہے جو یوں ہے ع

ییس کرِ گونگل تسے کرِ کراو

(جو شروع بہار میں بوئے گا وہی فصل بھی کاٹے گا۔)

حضرت شیخ العالمؒ کی اس غزل یا اس طرح کی دوسری غزلوں کے رنگ و آہنگ، اسلوب اور لفظیات کی طرز پر صوفی شعراء کی کئی نسلوں نے اپنے انتہائی پیچیدہ متصوفانہ تجربات کا اظہار

کیا ہے۔ سولھویں صدی میں کی شاعرہ ملکہ حبہ خاتون اور محمود گامی (۱۷۶۵ء۔ ۱۸۵۵ء) نے عشق کی شادمانیوں، ہجر کی ٹیسوں، وصل کے میٹھے اور دلکش تجربوں اور سوز و گداز کے اظہار کے لیے اسی 'وژن' کو برتنا۔ بعد میں رسول میر (متوفی ۱۸۹۴ء) نے وژن کو غزل کے اس قدر قریب کر دیا کہ ان دو اصناف کے درمیان جو موہوم سی دیوار تھی وہ بھی منہدم ہوگئی موجودہ صدی کی نصفِ اوّل میں مہجور (۱۸۸۷ء۔ ۱۹۵۲ء) اور آزاد (۱۹۰۳ء۔ ۱۹۴۸ء) ان دو شعری اصناف کے درمیان کوئی فرق نہ کر سکے اور انھوں نے اس میں موضوع کی سطح پر کئی نئے میلانات متعارف کیے۔

اس لحاظ سے 'وژن' کشمیری غزل کی قدیم ترین صورت ہے جو پانچ صدیوں کے بعد اس مقام تک پہنچی کہ جہاں یہ اب ہے اور جہاں شاعروں کے ایک کارواں نے اس کی اعلیٰ روایت کی بنا پر اسے عصری حسیّت کی پیچیدگیوں کے اظہار کے لیے موزوں میڈیم پایا ہے۔

قطعات

کلام شیخ العالمؒ کا بیشتر حصہ قطعات جیسی مختصر منظومات پر مشتمل ہے جو ہیئتی اعتبار سے پابند بحر میں ہیں اور جن میں کسی واحد موضوع یا باہم مربوط موضوعات کا اظہار ہوتا ہے۔ ان ہی قطعات یا دوسری مختصر نظموں کو حقیقتاً حضرت شیخ کے اشلوک (شینچہ شرو کی) کہا جاتا ہے۔ یہاں اس بات کا ذکر لازمی ہے کہ عوام کو ان میں سے اکثر قطعات ازبر ہیں اور وہ انھیں اس دانشور شاعر کے اقوال کے بطور موقع و محل کے ساتھ استعمال بھی کرتے ہیں۔

نظمیں

جیسا کہ ذکر ہوا ہے، حضرت شیخؒ نے نظموں کی ایک اچھی خاصی تعداد تخلیق کی ہے — طویل بھی، مختصر بھی، باعنوان بھی، بغیر عنوان بھی۔ بعض نظمیں ایسی ہیں جن کے لیے متعلقہ نظموں کے ٹیپ کے مصرعوں کو ہی عنوان کے طور استعمال کیا گیا ہے۔ ان میں منا جاتیں، نرنکی یا ون مُشر سے مخاطب نظمیں اور پہاڑی (کنڈی) علاقوں کی پسماندگی کے بیان کی حامل نظمیں شامل ہیں۔

مناجاتوں میں حضرت شیخؒ نہ صرف اپنی نجات اور معاشرے کی بہتری کے لیے دعا کرتے ہیں بلکہ اپنے دور کی معاشرتی و مذہبی تاریخ کا بھی انکشاف کرتے ہیں۔

ترنکی یاون مثر سے مخاطب ہو کر جو نظم لکھی گئی ہے اس میں وہ اپنی روحانی فکر کا علامتی اظہار کرتے ہیں۔ ایک اور نظم میں وہ کنڈی (پہاڑی) علاقوں میں رہنے بسنے والوں کی ناگفتہ بہ حالت کی عکاسی کرتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ وہاں کے گرد و نواح کی خوبصورتی کو بھی بیان کرتے ہیں۔

دوسری مختصر نظموں میں، جو آٹھ آٹھ یا دس دس مصرعوں پر مشتمل ہیں اور جن میں ٹیپ کا مصرعہ یا تو ہے یا پھر نہیں ہے، وہ اپنے باطنی تجربوں کی باریکیاں واضح کرتے ہیں۔ قاری تک اپنے پیغام کی اصل روح پہنچاتے ہیں یا اسے وقت کی ماہئیت کو نظرانداز کرنے کے نتائج سے آگاہ کرتے ہیں۔

نعت ایک مخصوص شعری صنف ہے جس میں خالصتاً حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح کی جاتی ہے۔ شروع میں وہ قصیدہ نعت کہلاتا تھا جس میں پیغمبر کے تئیں شاعر کی محبت و عقیدت اور جذباتی وابستگی کا اظہار ہوتا تھا۔ لیکن بعض فارسی شاعروں نے پیغمبرؐ کے تئیں اپنی عقیدت اور اپنے عشقیہ جذبات کا اظہار غزل کی ہئیت میں کیا۔ اب فارسی اور اردو شاعری، دونوں میں یہی شعری ہئیت مقبول ہے۔ اس رجحان نے کشمیری پر بھی گہرے اثرات مرتسم کیے۔ اس صنف کا مبارک آغاز حضرت شیخؒ نے کیا۔ وہ کشمیری کے پہلے نعت گو شاعر ہیں۔ ان کی لکھی ہوئی نعت نہ قصیدے کی ہئیت میں ہے، نہ غزل کی ہئیت میں اور نہ ہی ''وژن'' کی ہئیت میں۔ یہ یا تو قطعات کی صورت میں ہے یا پھر مختصر نظموں کی صورت میں۔

مثنوی فارسی شاعری کی قدیم ترین اصناف میں سے ہے اور یہ فارسی دنیا میں صدیوں تک حاوی صنف رہی۔ اردو اور کشمیری زبان میں بھی اس صنف میں شاہکار ملتے ہیں۔ اگرچہ کشمیری میں اس کے باقاعدہ آغاز کا سہرا انیسویں صدی کے شعراء پرکاش بھٹ اور محمود گامی کے سر باندھا جاتا ہے۔ لیکن یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ مثنوی کا اوّلین نمونہ ان متعدد اشعار سے ملتا ہے جو حضرت شیخؒ کی مشہور نظم ''ایک سو تیس سوالات اور جوابات'' میں شامل ہیں۔

یہاں پر ایسی شعری اصناف کے بارے میں اختصار کے ساتھ بات کی گئی جو فارسی شاعری کے اثرات کے تحت حضرت شیخ العالم نے متعارف کیں۔ تاہم آپ نے مقامی روایتی 'وژن' میں انقلاب لایا اور ایک ادبی دانشور کی طرح بیانیہ اور تصوّراتی، ہر دو طرح کی نظمیں متعارف کیں۔

اس کے ساتھ ساتھ حضرت شیخؒ نے سینکڑوں فارسی الفاظ و تراکیب اور تشبیہات کو مقبولِ عام بنایا۔ ان کے کلام کے مرتبّین نے ان کے سنسکرت آمیز اشعار کو "سنسکرتی" یا "پنڈتی" کا عنوان دیا ہے۔ بعض ایسی نظمیں (بالخصوص وہ جن میں جنّت کا بیان ہے) بھی ملتی ہیں جو فارسی الفاظ سے گراں بار ہیں۔

موضوع کے اعتبار سے ان کے کلام کو درجِ ذیل خاص زمروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

۱۔ الوہی شاعری، ۲۔ نعت، ۳۔ بے ثباتی دنیا، ۴۔ توحید، ۵۔ حیات بعد ممات، ۶۔ دُنیوی اعمال کا آخرت میں حساب، ۷۔ اخلاقی شاعری، ۸۔ دینی (اسلامی) شاعری، ۹۔ انسان دوستی، ۱۰۔ فرقہ وارانہ ہم آہنگی، ۱۱۔ غنائیت، ۱۲۔ بیانیہ اور ۱۳۔ طنز و تعریض۔

تاہم ایک ولی ہونے کی حیثیت سے حضرت شیخؒ کی بیش تر شاعری خالق کے تئیں ان کے عشق اور عقیدت کے موضوعات کے گرد گھومتی ہے۔ متعدد طویل نظمیں اور سینکڑوں قطعات ایسے ہیں جن میں وہ اللہ کی حمد و ثنا کرتے ہیں۔ ان نعمتوں کا ذکر کرتے ہیں جن سے خدا نے اپنی مخلوق کو نوازا ہے، اس کی صفات کا، بندوں پر اس کے رحم و کرم کا اور اس کے حاظر و ناظر ہونے کا بیان کرتے ہیں۔ حضرت شیخؒ نے اگرچہ اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ اللہ کی عبادت و ریاضت اور اس کے احکام کی تعمیل میں گزارا لیکن ان کی عاجزی دیکھیے جو یوں ظاہر ہوتی ہے ؎

میں دن میں سینکڑوں بار سجدہ ریز ہوا
اور ساری رات آنکھوں میں کاٹی
زہے نصیب، اگر وہ قبول فرمائے
ورنہ میرا یہ عمل ایسا ہی ہے جیسے آوارہ کتّے کا بھٹکنا

شاعر کے خیال میں خالق ہر اس چیز کا جوہر ہے جو اس نے تخلیق کی اور ہر وہ شے جو اس نے تخلیق کی اس کا مظہر ہے ؎

اے خدا! زمین و آسمان کی حقیقت تم ہی ہو
خاکی قالبوں کا جوہرِ اصلی بھی تم ہی ہو
تم ہی ہو کہ جس کا 'بنا آواز کے ہی' ہر سو غلغلہ ہے
اور تیری ذات گناہ و ثواب سے اعلیٰ و ارفع ہے

اللہ اعلیٰ و ادنیٰ، ہر شے کا خالق ہے اور اس کی خلّاقی کا ہُنر شاعر کا بنیادی موضوع ہے ؎

تو نے "گنے" کو گُڑ اور نرگس کو شہد بخشا
تو نے ٹیڑھی میڑھی بیل کو انگوروں سے ثمر بار کیا
مولا! تیری قدرت پر میں نثار
تو نے جنگل کے ہرن کو نافہ سے مشکبار کیا

شاعر اللہ کا مخلص اور فرماں بردار بندہ ہے جس نے خود کو اللہ کے سپرد کیا ہے۔ ذیل کے شعر میں اللہ کے حقیقی بندے کی تعریف ہے ؎

جو اللہ کے تیر کے آگے سپر نہیں رکھتا
اللہ کی شمشیر کے آگے سر خم کرنے سے نہیں ہچکچاتا
اللہ کے قہر کو لطف و کرم سمجھتا ہے،
ہر دو عالم میں کامیابی اُسی کے لیے ہے۔

ایک اور دعائیہ نظم میں انھوں نے مقامی سنتوں، خاص طور پر ہندو سنتوں کے کئی حوالے دیتے ہیں۔ وہ یا تو ان کے پیش رو تھے یا ہمعصر۔ ان میں بیش تر کے بارے میں بصورت دیگر کوئی تاریخی مواد دستیاب نہیں ہے۔ اس لحاظ سے تواریخ کے طالب علموں کے لیے یہ نظمیں کافی اہمیت کی حامل ہیں۔ پیر حسن کھویہامی نے اپنی تاریخ کی تیسری جلد میں ریشیوں کے بارے میں اپنی تحریر کی بنیاد غالباً اسی مواد پر رکھی ہے جو حضرت شیخؒ کی اس طرح کی نظموں سے فراہم ہوتا ہے۔ شاعر نے اسی روحانی مرتبہ کے حصول کی دعا کی ہے جو روحانیت کی قلمرو میں ان کے

پیش رو مقامی بزرگوں کو حاصل تھا۔ یہ نظمیں (جن میں ایسی دعائیں ملتی ہیں) مسجدوں اور درگاہوں میں روزانہ عبادت کا جُز بن گئی ہیں اور یوں حضرت شیخؒ نے دو فرقوں کے درمیان تعصب کی دیواریں منہدم کی ہیں۔ اس امر کی رو سے یہاں باہمی خلوص و احترام اور رواداری کے ماحول کی بنیادیں مضبوط اور مستحکم ہوگئیں۔

پدمان پور کی لل (للہ عارفہ)
جس نے شکم سیر ہوکر امرت پی لیا
اس عظیم یوگنی نے اوتاروں کو گود کھلایا
میرے اللہ، مجھے بھی ایسا ہی وردان عطا کر

☆

[1] لکہ بھون کی گونگی لڑکی
جس نے پیاسوں کو پانی پلایا
اپنے پالے ہوئے پرندوں کے ساتھ اونچائی پر پرواز کرگئی
میرے اللہ مجھے بھی ایسا ہی وردان عطا کر۔

بھونؔ کی ایک گونگی ہندو لڑکی پانی سے بھرے مٹکے ٹیلے پر واقع گاؤں لے جایا کرتی تھی اور روز کی مزدوری اناج کے چند دانوں کی صورت میں پاتی تھی۔ یہ اناج وہ پرندوں کو کھلاتی اور خود فاقہ کرتی تھی۔ خدا اُس سے اس قدر خوش ہوا کہ اُسے ان پرندوں کے ساتھ اُڑنے کی طاقت عطا ہوئی۔

ایک اور نظم میں حضرت شیخؒ نے آنے والی نسلوں کے لیے کشمیر کے ان ریشیوں کے بارے میں مختصر مگر قابل قدر معلومات فراہم کی ہیں جو قعر گمنامی اور فراموشی کے عالم میں تھے ؎

ڈنڈک وَن کے زلکا ریشی
جس نے خودرو جھاڑیوں کا شیرہ نکال کر گزر بسر کی

---

[1] بھون جنوبی کشمیر کا ایک گاؤں ہے۔ (بھون موجودہ مٹن کا دوسرا نام ہے جبکہ لکہ بھون ایک اور گاؤں ہے جو اننت ناگ ڈورو شاہ آباد کے درمیان لارکی پورہ گاؤں کے متصل ہے — مترجم۔)

ایسے ریشی واقعی خوش نصیب ہیں
میرے اللہ! اپنے بندوں سے راضی ہو

اس نظم اور بعض دوسری نظموں میں انھوں نے پلاس ریشی، یاسمن ریشی، پلاسمن ریشیؒ اور خلاسمن ریشی کے بارے میں بھی کچھ مواد فراہم کیا۔

اسی قبیل کی بعض اور نظموں میں حضرت شیخ نے خالقِ کائنات کے تئیں اپنی عقیدت، آخرت میں اعمال کے حساب، کائنات کو بخشی ہوئی اللہ کی نعمتوں، قیامت کے خوف، جہنم کی دہشت اور جنتؔ کے سکون کو بیان کیا ہے۔

حضرت شیخؒ پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سچّے اور مخلص عاشق ہیں۔ ان کے خیال میں ہر دو جہاں میں نجات اور مسرت اُس کے لیے ہے جو مکمل طور پر سرورِ کائناتؐ کے نقشِ قدم پر چلے۔ اسلام کے حقیقی مفہوم کو انھوں نے مختصراً اور سادہ لفظوں میں ذیل کے قطعے میں سمویا ہے ؎

محمد عربیؐ اور خلفائے اربعہؓ کو حق جان
ان ہی کی پیروی کر
اسی سے تمارے دنیاوی مسائل حل ہو سکتے ہیں۔
ان کے نقش قدم پر چلو گے
تو دونوں جہاں میں شادکام رہو گے۔

ایک اور قطعہ میں پیغمبرؐ کے تئیں گہری عقیدت اور والہانہ محبت کو انھوں نے جذباتی خلوص کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اور وہ بھی فنیّ مہارت کے ساتھ ؎

ارے زیرک، کفر کا راستہ ترک کردے
اور حق کے راستے کو اختیار کرلے
ہمارے بُرے اعمال ہمیں دوزخ کی آگ کی طرف گھسیٹ لیں گے
لیکن اس سے بھی بڑی سزا یہ ہے کہ ہماری وجہ سے
حشر کے روز حضرت محمدؐ کو تکلیف ہوگی (معاذاللہ)

یہاں شیخ العالمؒ حضرت محمدؐ کی ناراضگی کو دوزخ کے عذاب سے بھی شدید تر سزا قرار دیتے

ہیں۔ اسی موضوع پر اپنے ایک قطعے میں بیسویں صدی کے اردو شاعر علامہ اقبال خدا سے دعا کرتے ہیں کہ روزِ حساب اگر میرا نامۂ اعمال کھولنا ناگزیر ہی بن جائے لیکن ہمارے نبیؐ سے اسے چھپائے رکھنا۔

اہل بیت کے تئیں حضرت شیخؒ کی محبت کا بھرپور مظاہرہ ان کی ذیل کی نظم سے ہوتا ہے ؎

(بیٹی کا مقام بہت بڑا اور ممتاز ہے)
بیٹی حضرت محمدؐ کے یہاں پیدا ہوئی
اس بیٹی کی پیدائش نے دنیا کو زینت بخشی
وہی بیٹی شاہِ ولایتؓ کے عقد میں آگئی
اس بیٹی نے دو ارجمند فرزندوں کو جنم دیا
وہی بیٹی قیامت کے دن ہماری شفاعت کرے گی
وہ بیٹی اگر پیدا نہ ہوتی تو یہ دنیا اذیت اور دکھ سے پارہ پارہ ہوئی ہوتی۔

کلامِ شیخؒ کو عام طور پر "کاشُر قرآن" (کشمیری قرآن) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ایسا اس لیے کہ ان کے قطعات اور ان کی نظموں کے موضوعات کا محور کتابِ الٰہی کی کوئی نہ کوئی آیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام کو "شرک" کا نام دیا گیا جسے خود حضرت شیخؒ نے حدیث کے معنوں میں استعمال کیا تھا۔ قرآن نے توحید، صراطِ مستقیم پر کاربند رہنے، نماز پنجگانہ کی باقاعدگی سے ادائیگی اور سالانہ ذکواۃ اور فریضہ حج کی ادائیگی کی تاکید کی ہے۔ مزید برآں قرآن نے مسلمان کو احکام خداوندی کی تعمیل، اُس کے حاضر و ناظر ہونے پر مکمل ایمان اور خلقِ خدا سے محبت اور اس کی خدمت کی تعلیم دی ہے۔

اللہ ایک ہے۔ وہ نہ کسی کی اولاد ہے اور نہ ہی اس کی کوئی اولاد ہے، لیکن اس کے اوصاف اور اس کی جہات بے شمار ہیں ؎

وہ خود ہی نفی اور اثبات کا کھیل کھیلتا ہے
اور اس کا یہ کھیل لمحہ بھر کے لیے بھی نہیں رُکتا
اس نے اپنے ظہور سے اپنی صفات کی آرائش کی

وہ جنم اور مرن (پیدائش اور موت) سے ماورا ہے
اس نے حضرت انسان کو شرف بخشا۔
اگر زیرک ہو تو اس راز کو سمجھ لے
تم سب کچھ اپنے اندر دیکھ لو گے۔
اسے نہ نیند آتی ہے اور نہ بھوک لگتی ہے۔
وہ کہ جس نے ان حقیقتوں کا عرفان حاصل نہیں کیا
اُس اندھے کی طرح ہے
جس کے لیے رات اور دن میں کوئی فرق نہیں۔

☆

خُدا ایک ہے
مگر اس کے نام انیک ہیں
کائنات کا ذرّہ ذرّہ اس کے ذکر میں مصروف ہے
اس کے در پہ جو شوق سے منتظر رہتا ہے
اسے وہ خود امرت پلائے گا۔
اِس ڈرامے کے مناظر مختلف ہیں لیکن اداکار ایک ہی ہے
اِس حقیقت کو صرف دیکھنے والی آنکھ ہی دیکھ سکتی ہے۔

شاعر نے بار بار اس بات کی تبلیغ کی ہے کہ انسان کو ہر وقت اللہ سے ڈرنا چاہیے۔ جس شخص کو اس بات پر غیر متزلزل یقین ہو کہ وہ اللہ کے سامنے اپنے اعمال کے لیے جواب دہ ہے اور جو خوفِ خدا سے لرزتا ہو وہ ضرور صراطِ مستقیم پر چلے گا۔

تم اگر شیر بھی ہو تو گیدڑ کی طرح خوف سے تھرّا جا
شریعت کا باندھ مت توڑ
تم تیرنا نہیں جانتے تو کنارے پر ہی خود کو ڈبو دے
اپنی ذات کو اپنے اور خدا کے درمیان دیوار مت بنا۔

قرآن کی رو سے نماز وہ ضابطہ ہے جو انسان کو گناہ اور بدی سے دُور رکھتا ہے۔ سرورِ کائناتؐ نے اسے مومن کی معراج کہا ہے۔ حضرت شیخؒ کی شاعری اس لحاظ سے اسلام کے بنیادی ضابطہ کی باقاعدہ پیروی پر زور دیتی ہے ؎

دنیا میں آنا تو اُن لوگوں کا ہے
جو محنت کی روزی کماتے ہیں اور نماز پڑھتے ہیں۔
ان کے کھیت وسیع و عریض ہیں اور انھیں مسلسل کھیتی کرنی ہے۔
وہ واقعی اچھی فصل کاٹیں گے
وہ پار اُتریں گے اور دوزخ کی آگ سے بچ جائیں گے
اور ان کا اللہ ان پر رحم کرے گا۔
پس باقاعدہ پانچ وقت نماز پڑھا کر
اپنے نفسِ امارہ کو مار اور وہی نماز ہے۔
شیو اور شکتی کو ایک کر
اور اسی میں نماز کا انمول خزانہ ہے۔

شاعر نے پانچوں وقت کی نماز یعنی فجر، ظہر، عصر، مغرب اور عشاء پر خصوصی زور دے کر نماز کا فلسفہ بیان کیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ دوسری نوع کی نمازوں اور نوافل کی بھی تاکید کی ہے۔ اس طرح کے تمام اشعار کا حوالہ زیرِ نظر باب کے لیے طوالت کا باعث ہوگا۔

ایک اور مختصر نظم میں وہ رمضان کے مہینے میں روزہ رکھنے اور نماز ادا کرنے کی تاکید کرتے ہیں ؎

اے بندے! نماز اور ماہِ رمضان سے لَو لگا۔
یہی تو تماری نجات کے وسیلے ہیں۔
قرآن اور حدیث پر کان دھر
اسی میں تماری طاقت ہے۔
دنیا نے کیا کیا بہادر دیکھے ہیں
تمھیں بھی ان ہی کی طرح موت کا پیالہ پینا ہے۔

تمارے دوست احباب دمِ آخر کچھ دیر تمارے گرد بیٹھیں گے
تمارے مرنے پر چیخیں چلائیں گے
پھر آخری غسل کے لیے لے لیں گے
تمارے گیلے بدن کو کفن سے ڈھانپ لیں گے
اور دُور قبرستان میں لے جائیں گے
صرف تمارے اعمال ـــ اچھے یا بُرے ـ تمارے ساتھ جائیں گے

سچّائی ہر مذہب کا جوہر ہے اور تمام اخلاقی اقدار کی بنیاد ۔ اسی لیے حضرت شیخؒ نے ہر جگہ جھوٹ کی مذمّت کی ہے ؎

سچ بولتے ہوئے پتّوں کی طرح تھر تھرا اُٹھے گا
اور جھوٹ بولتے ہوئے تجھے لطف ملے گا
تو نے اللہ کو چھوڑ کر ابلیس کی پیروی کی
افسوس اِ تماری قسمت میں یہی لکھا ہے، تو اسے کیسے چھپا سکتا ہے ۔

کلامِ شیخ العالم زیادہ تر اخلاقی ہے ۔ اخلاقی قدریں قوانین کی طرح نہیں ہوتیں کہ جن کو نافذ کیا جاسکے لیکن یہ مدوّن قوانین سے زیادہ طاقتور ہوتی ہیں ۔ ان کی طاقت اس گہرے عقیدے میں مضمر ہے کہ انسانی اعمال کی جانچ پڑتال کسی فوق البشری قوت سے ہوتی ہے جسے ہمارے چھوٹے سے چھوٹے پوشیدہ اعمال کا پوری طرح سے علم ہے ۔ یہ عقیدہ اس ایمان پر استوار ہے کہ ہر شخص اس قوت کے سامنے جواب دہ ہے اور یہ صورت حال ہم میں سے ہر ایک کے لیے ناگزیر ہے ۔ یہ اعتقاد کہ انسان اپنے اعمال کے لیے جواب دہ ہے اور اسے جزا یا سزا پانا ہی ہے، اس اخلاقی نظام کا بنیادی ستون ہے جس کی وضاحت اور عکاسی حضرت شیخ کی شاعری کرتی ہے ۔

حضرت شیخ نے اپنے اشعار میں جہنم کے عذاب کی ہولناک تصویر کھینچی ہے اور جنّت کے پُرسکون منظر کا موزون بیان کیا ہے ۔ انھوں نے اپنے پیروکاروں کو سزا کی شدّت اور جنّت کے آرام و سکون، ہر دو سے آگاہ کیا ہے ؎

تو نے جو وعدہ کیا ہے، وہی کر
وہی کر کہ تماری یادداشت تازہ رہے

مرنے سے پہلے ہی مر
اس صورت میں تمھیں مرنے کے بعد یاد کیا جائے گا۔

نفس کشی تفکّر کا لُبِ لباب ہے اور نفسِ امّارہ کو قابو میں رکھنا نفس کشی کا جوہر ہے۔ حضرت شیخ نے نفس امّارہ کو تج دینے کا مضمون بڑی شدّت سے اور زور دے کر بیان کیا ہے اور یہ مضمون ان کی شاعری میں بار بار آیا ہے۔ تاہم ہر بار اس مضمون کا انداز نیا نظر آتا ہے اور تکرار اُکتاہٹ کا باعث نہیں بن جاتی۔ ان بلند اصولوں کی تبلیغ کرتے ہوئے انھوں نے اپنے یہاں میں ضمیر متکلم کا استعمال کیا ہے اور یوں نفس امّارہ کے بڑے نتائج کو خود اپنی ذات تک محدود رکھا ہے ؎

افسوس کہ مجھے نفس امّارہ نے مارا !!
اس نے مجھے ظلمت کے اندھے کنویں میں دھکیل دیا
کاش میرے ہاتھ آجائے
تو میں (اپنے عمل کی) تلوار سے اس کی گردن کاٹ دوں۔

☆

اے نفس امّارہ! تو نے مجھے برباد کیا
میں نے حرص و ہوس سے تماری پرورش کی
تو میرا فریب ترین اور سخت ترین دشمن ہے
تو نے میرے خون کو قطرہ قطرہ چوس لیا۔
افسوس کہ میں نفس امّارہ کو مار نہیں سکا
اس کو خوش رکھتے ہوئے میں نے اپنا مقصد ہی کھو دیا
اب میں اپنے اعمال پر کتنا روؤں
نفس امّارہ نے مجھے کہیں کا نہیں رکھا۔

زندگی بھر کی ان تھک عبادت اور تفکّر، خالقِ ارض و سما کی والہانہ بندگی اور اس کی پیدا کردہ ہر شے کے تئیں والہانہ محبت کے باوجود حضرت شیخ کو ہر وقت یہ افسوس ہوتا تھا کہ

ان کا ہر لمحہ عبادت میں نہیں گزرا۔ چنانچہ اپنے اس تمام والہانہ پن کے باوجود وہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کی زندگی بے سُود گزری ؂

میں اپنے شباب کے دوران سو گیا
کام کا ایک دن بھی میرے کھاتے میں نہیں آیا
جوانی کے دنوں میں سستی اور کاہلی مجھ پر غالب آگئی
میں نے حرص و ہوس کو قابو میں نہیں لایا اور (نتائج کا) اندازہ نہیں کیا۔
اب ہوش آیا کہ جب حرکت کرنا بھی مشکل ہے۔
میں اپنے روٹھے محبوب کو منوالوں کیسے ؟
اب احساس ہو رہا ہے کہ دوپہر کو ہی مجھ پر شام طاری ہوئی
افسوس کہ میں اپنی غلطیوں کو سمجھ نہ سکا۔

شیخ العالمؒ کے دَور میں ہندو سماج ذات پات کے بھید بھاؤ کے باعث پہلے ہی تباہی سے دوچار ہوا تھا۔ جیسا کہ ذکر ہوا ہے، دنیاوی آسائشوں اور سرکاری مراعات کے گرویدہ بعض علماء پر بھی اس مقامی انتشار کا بالواسطہ اثر پڑا اور انھوں نے اسی نوع کی بنیاد پر مسلم معاشرے کو اندر ہی اندر تقسیم کرنا شروع کیا۔ حضرت شیخؒ اس طرح کی سماجی برائیوں کے خلاف بڑے جوش و خروش کے ساتھ سامنے آئے۔ انھوں نے اسلام کے نظریاتی ماحول کی توضیحات کی مدد سے اپنے نقطۂ نظر پر زور دیا ؂

آذر کو دیکھ، وہ خود بُت گر تھا
لیکن اس کے فرزند ــــ خلیل اللہؑ نے
ــــــ اِن سارے بتوں کو پاش پاش کیا
اور کفر کے خلاف جہاد کیا
اپنے ہاتھوں سے کعبتہ اللہ کی تعمیر کی۔
خاندانِ قریش بہت ہی اعلیٰ خاندان ہے
اس خاندان کا ایک مردود بیٹا پتھر دل ابولہب تھا

اس کا اپنا بھتیجا خاتم النبیٔین تھا
ابو جہل کُتّے کی موت مرا
کہ جس نے اپنے بھتیجے کو مکّے سے نکال دیا

یہ دنیا فانی ہے
لیکن لافانی ہیں وہ کام جو اللہ کے نام پر کیے جائیں۔

☆

کمینہ ہے وہ شخص جو اپنے حسب نسب پر فخر کرے
افسوس! کہ اس کے پاس نہ فہم ہے نہ فراست

ذکر ہو چکا ہے کہ حضرت شیخؒ کے زمانے میں بعض مفاد پرست عناصر نے دو فرقوں کے درمیان جس تصادم کو لاکھڑا کیا تھا اس نے ہماری اعلیٰ قدروں کے لیے زبردست خطرہ پیدا کیا۔ یہ صورت حال کسی پیغمبرانہ ترغیب کی بروقت مداخلت کی متقاضی تھی چنانچہ حضرت شیخؒ نے اپنے میٹھے کلام کے جادو سے اس بحران کو دُور کیا اور مذہبی رواداری کی بنیاد ڈالی ؎

یخ، کورا اور برف
تینوں کی اصل پانی ہے

☆

ایک ہی ماں باپ کے دو بیٹوں
یعنی ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان
یہ نفرت کی خلیج کیوں
میرے اللہ! اپنے بندوں سے راضی ہو جا

حرص و ہوس، شہوت، غصّہ اور حسد کے خلاف حضرت شیخ کے خیالات ان کے کلام میں بہت ہی نمایاں ہیں ؎

حرص و ہوس، حسد، غرور
شہوت، تکبّر اور غصّہ

۔ان جذبات کو قابو میں کرنے سے
میں نے کسی ملاح کی مدد کے بغیر اپنی کشتی پار اتار لی۔
تب میں نے جان لیا کہ میں کیا ہوں۔

انھوں نے ایک نظم کے ٹیپ کے مصرعے "غرور مسلمان کو زیب نہیں دیتا" کو ہی نظم کا عنوان رکھا ہے ؎

غرور تمارے اثاثے کو تباہ کردے گا
اس کے شعلے تمارے تفکر کو بھسم کر دیں گے
غرور تمارے قیمتی خزانے کو لوٹ لے گا
خبردار! غرور مسلمان کو زیب نہیں دیتا

ایک قطعہ میں وہ کہتے ہیں ؎

حسد، حرص و آذ، ہوس اور غرور
۔یہ سب دوزخ کی آگ کا سامان ہیں
حضرت محمدؐ تمارے لیے نجات لے کر آئے ہیں
نجات کی خواہش ہے تو اُن سے (عجز و حلم) خرید لے۔

شیخ العالمؒ اس صوفی مسلک سے تعلق رکھتے تھے جس کے مطابق یہ دنیا محض ایک خواب، فریب اور لمحاتی خوشی کی جگہ ہے۔اس کی ہر شے (بلکہ خود یہ دنیا) بے ثبات و ناپائیدار ہے۔

کلام شیخؒ کے مرتبین نے کئی وژنوں کو غزل کے عنوان کے تحت شامل کیا ہے اور ان میں سے بیش تر تخلیقات دنیا اور دنیاوی آسائشوں کی بے ثباتی کی عکاسی کرتی ہیں ؎

(۱)

دنیا فریب اور دھوکا ہے
پھر اس پر تم اِتراتے کیوں ہو؟
تم نے زندگی پیٹ بھرنے میں صرف کی

آتے ہوئے تم خوشی سے پھولے نہیں سمائے
لیکن جاتے ہوئے ــــ
دُکھ اور افسوس کے سوا تمارے دامن میں کچھ نہیں
یہ دنیا تو فریب اور دھوکا ہے۔

☆

تمارے اِردگرد گہری اندھیری کھائیاں ہیں
دنیا لرز رہی ہے
اور دریا کا ساحل دلدل والا ہے۔
یہ دنیا تو فریب اور دھوکا ہے

(۲)

چالوں اور فریب کاری کو میں نہیں سمجھا
اپنی عمارت کو نمود و نمائش اور چمک دمک کے سامان سے
آراستہ کیا
دنیا رات کے خواب کے سوا کچھ نہیں ہے
چلیے اب گھر چلیں کہ کھیل ختم ہوا

☆

سوکھی گھاس میں آگ لگی ہوئی تھی
جو تیز ہوا سے چاروں اور پھیل گئی تھی
اب نہ آگ ہے نہ دھواں
ٹھگ نے مجھے بے خبری میں لُوٹ لیا ہے
چلیے اب گھر چلیں کہ کھیل ختم ہوا۔

☆

میں نے بیٹے بیٹیوں سے ساری اُمیدیں وابستہ کیں

افسوس کہ اپنے اوپر ظلم اور جبر کیا
اور مرنے کی خبر بھول گیا۔
چلیے اب گھر چلیں کہ کھیل ختم ہوا۔

ایک اور غزل کہ جس کی ترجیع ہے "اندھا رستے سے بھٹک گیا ہے، منزل کیسے پالے گا" میں شاعر نے کہا ہے ؎

میرے ترکش گھوڑے کے سُم دلدل میں پھنس گئے ہیں
اب میں دُور تنہائی میں اپنے کیے پر پچھتاتا اور روتا رہتا ہوں
نفس امّارہ کا کیا کروں جو میرا ظالم بن گیا ہے
اندھا رستے سے بھٹک گیا ہے
کچھ تو احساس کرلے کہ منزل کو کیسے پالے گا

☆

تقدیر کے لکھے کا میں کیا کروں
یہ عمارت ہِل گئی ہے اور اب گرنے والی ہے
اس کا سنگِ بنیاد تیزی سے کھسک رہا ہے
اندھا رستے سے بھٹک گیا ہے
کچھ تو احساس کرلے کہ منزل کو کیسے پالے گا۔

☆

میں اس کلجگ میں کس لیے پیدا ہوا
میرے گرد و پیش نے مجھے حیرت میں ڈال دیا
میری جوانی کا انمول لعل چُور چُور ہو گیا
اندھا رستے سے بھٹک گیا ہے
کچھ تو احساس کرلے کہ منزل کو کیسے پالے گا۔

☆

چندن کے شہتیر کو اب گھن لگ چکا ہے
میں دوزخ کی آگ سے خود کو کیسے بچا لوں
اندھا رستے سے بھٹک گیا ہے
کچھ تو احساس کرلے کہ منزل کو کیسے پالے گا

☆

چوری کر کے اور عزت و آبرو بیچ کر میں اس سگ کو پالتا رہا
اب اس پر سوچتا ہوں تو پچھتاتا اور روتا رہتا ہوں
اب میری اکیلی ذات ہے کہ جسے اپنے کرموں کا پھل بھگتنا ہے
اندھا رستے سے بھٹک گیا ہے
کچھ تو احساس کرلے کہ منزل کو کیسے پالے گا

☆

خوبصورت اور سڈول جسم پر اب خزاں کی زردی چھا گئی
اور چہرے پر جھرّیاں نمودار ہو گئیں
نندریشی! اب ہاتھ اُٹھا اور خُدا سے رحم کی دعا مانگ
اندھا رستے سے بھٹک گیا ہے
کچھ تو احساس کرلے کہ منزل کو کیسے پالے گا

حضرت شیخؒ اپنے وقت کے سب سے بڑے صوفی تھے اور انھوں نے اپنے پیچیدہ متصوفانہ خیالات کا (بھی) اظہار کیا ہے۔ 'فقر' صوفی کے بنیادی اوصاف میں سے ہے ؎

فقر دوزخ کی آگ سے بچنے کا سامان ہے
فقر تو خوئے انبیاء ہے
فقر بیش قیمت ہے اور ہر دو جہاں کا جوہر ہے
یہ ایک مہکتی ہوئی خوشبو ہے
فقر حس اور احساس کو سدا کے لیے مجروح کرتا ہے

یہ رگوں میں چبھتا اور مجروح انا کو ٹھیک کرتا ہے
کمزور کاندھوں پر اس کا بھاری بوجھ اٹھانا مشکل ہے

عشق سالک کا عزیز ترین راستہ ہے اور اپنے محبوب کے تئیں اس کی دیوانہ وار عقیدت اسے ترغیب اور تحریک دیتی ہے۔ عشق عاشق کا صبر ہے۔ اس کی ٹیسیں اگرچہ شدید ہوتی ہیں لیکن یہ اسے بے حد مسرّت بہم پہنچاتی ہیں۔ عاشق کو عشق میں جن مصیبتوں، دکھوں اور اذیتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ اپنی شدّت کے باوجود اسے صبر و سکون، طمانیت اور روحانی مسرّت فراہم کرتی ہیں۔ دردِ عشق کو شاعر نے اس طرح شعری روپ دیا ہے ؎

عشق، ماں کے اکلوتے بیٹے کی موت ہے
کیا وہ راحت کا سانس لے سکتی ہے؟
عشق کانٹوں کے بستر پر لیٹنا ہے
کیا ایسے میں آدمی پلک جھپک سکتا ہے؟
عشق ننگے بدن کو بھڑوں کے چھتے میں ڈالنا ہے
کیا اس میں لمحہ بھر آرام مل سکتا ہے؟
عشق میدان جنگ میں فوج کی قیادت کرنا ہے
کیا آدمی اپنے قدم پیچھے ہٹا سکتا ہے؟
عشق اپنے خون سے رنگا ہوا لباس پہننا ہے
کیا اس لباس کو کوئی اُتار سکتا ہے؟
عشق سر پر بوجھ اٹھائے تلوار کی دھار پر سے طوفانی ندی کو پار کرنا ہے
کیا کوئی دائیں بائیں مڑ سکتا ہے؟
عشق ننگی تلوار کے سامنے سر خم کرنا ہے
کیا کوئی بچ کر لوٹ سکتا ہے؟

ایک اور قطعہ میں عاشق کی تعریف یوں کی گئی ہے ؎

وہ دہکتے بھٹّے کے شعلوں میں جل کر بھی

خالص سونے کی طرح چمکتا ہے
وہ اندر ہی اندر عشق کی آگ میں جلتا ہے
وہی ہے جو لامکاں تک پہنچ جائے گا

حضرت شیخ کے متصوفانہ اظہار سے تعلق رکھنے والے چند قطعات بغیر کسی تبصرے کے پیش ہیں، ملاحظہ ہوں ؎

یہاں آئے مگر معلوم نہیں کہ کہاں جانا ہے
یہ نہ جانا کہ اس سفر میں چوراہے بھی آئیں گے۔
جس کی مٹھی میں ہماری تقدیر ہے
کیا ہم اسے محض خوشامد سے آمادہ کر سکتے ہیں؟

☆

میں دنیا کے پُرکشش بازار میں
خوشیوں کا طواف کرتا رہا
شیطان نے میرا سارا اثاثہ بھسم کر ڈالا
اور میں چور کی طرح اُلجھن میں بھاگنے کا رستہ بھی بھول گیا۔

☆

مری روح! تم نے کوئی مناسب وقت کیوں نہ چنا
جب تک تماری پاکیزگی آلودہ ہو گئی
موت تاک میں بیٹھی ہے
جیسے جھیل میں مچھلی کی تاک میں مچھیرا۔
اور بھر کرایہ دار کو یہ جگہ خالی کرنا ہی ہے!

☆

'دال'، 'الف'، اور 'میم'، کے ساتھ مِل گیا
'ح'، 'نے'، 'ب'، کو نیست و نابود کر دیا

میں نے 'احد' کی تلاش میں چھ کے چھ حواس کو بند کر دیا
(اور یوں) احمد بلا میم سے میں مل گیا۔

ا، ح، د، ب اور م — یہ سب عربی کے حروف تہجی ہیں۔ 'ا' توحید کی علامت ہے۔ 'ح' لافانیت کی، 'د' وحدت کی، 'ب' دوئی کی وغیرہ وغیرہ۔ آ، ح اور د سے لفظ احد بنتا ہے جس کے معنی ہیں 'ایک'۔ جب اس میں 'م' شامل کیا جائے تو 'احمد' بنتا ہے۔ اس قطعہ میں عارف و شاعر حضرت شیخؒ ان مدارج کی طرف اشارہ کرتے ہیں جن سے گزر کر انھوں نے حقیقت مطلق تک رسائی حاصل کی۔ انھوں نے دوئی کو ختم کرنے اور حقیقت مطلق کی وحدانیت اور ابدیت کو سمجھنے سے وحدت کو پالیا۔ اپنی منزلِ مقصود (یعنی قادر مطلق) کو انھوں نے حضرت محمدؐ کے فیض و برکت کے طفیل پالیا ؎

وہ میرے پاس ہے اور میں اس کے پاس ہوں
بے قراری اُس کی قربت کے طفیل ختم ہوئی
میں بے سود اس کو پردیس میں ڈھونڈتا رہا
وہ تو مجھے اپنے ہی دیس میں ملا

☆

وہ قیل و قال کو نہیں دیکھتا
بلکہ دلوں کے حال میں دلچسپی رکھتا ہے
ذکرِ حق کر مگر خاموشی سے
تبھی شاید راج ہنس تمارے دام میں آجائے

محبوبِ حقیقی سے اپنے وصل کے تجربات کا اظہار انھوں نے سادہ خیالات میں کیا ہے۔ تجربہ سادہ ہے اور شاعر نے جو راہ اختیار کی ہے وہ سیدھی ہے ؎

بغیر چپو کے میں نے اپنی کشتی دریا کے پار اُتار دی
غصّہ، حسد اور شہوانیت کے جذبات کا گلا گھونٹ دیا

خلوصِ نیّت اور سچّے دل سے خُدا کو ڈھونڈا
جب ہی میں نے خود کو پہچانا۔

☆

نماز تمہارے کھیتوں میں بیج بوتی ہے
تمہارے حُسنِ سلوک سے اس کی فصل پک جائے گی
پانی کے بغیر یہ فصل نہیں بڑھے گی
تمہارا دل خشک نہیں رہنا چاہیے
اسے ذکر کی مرطوب آب و ہوا کی ضرورت ہے
اپنے وجود کے جوہر کو تراش لے
اس کی چمک محبوب کی نظر کو کھینچ لے گی۔

☆

میں نے کلمۂ محمدؐ کی تحقیق کی
تو سجدوں میں لافانی وجود کا دیدار کیا
اپنے وجود کے اندر ہی مجھے وہ موجود مِل گیا
اور ہر سو اس کا دیدار نصیب ہوا۔
مقام محمود پر میں نے حضرت محمدؐ کی زیارت کی
جن سے میں نے فرائض و سنّت اور شریعت کی باریکیوں کو سیکھا۔

☆

علم کا منبع کلمہ کے معنی میں ہے
فکر کا منبع تذکیہ نفس
خلاء کا منبع وہ خود جانتا ہے
سمندر کا منبع لامحدودیت میں ہے

متعدد نظمیں، قطعات اور اشعار ایسے ہیں جو متصوفانہ خیالات، حکیمانہ نصائح اور

عارفانہ تجربوں سے مملو ہیں۔

قرآن ہر مسلمان کے لیے ضابطۂ عمل ہے۔ اس لحاظ سے سچّا اور صحیح مسلمان اپنی زندگی کو ان ہی اصولوں کے مطابق ڈھالتا ہے جو قرآن میں بتائے گئے ہیں۔ لیکن صوفی اپنی زندگی کو قرآن کے مطابق ڈھالنے کے ساتھ ساتھ اس کی ہر آیت سے عشق کرتے ہیں۔ اس کی قرأت سے انتہائی مسرت حاصل کرتے ہیں اور اس میں جو سادہ مگر ہمہ جہت رشد و ہدایت ہے اس سے اپنے پیچیدہ مابعدالطبیعاتی مسائل کا حل نکالتے ہیں۔ قرآن کی قرأت سے قاری کو کیا اثر لے لینا چاہیے، اس کا خلاصہ حضرت شیخ نے اپنے تجربے کی بنیاد پر یوں بیان کیا ہے ؎

قرآن پڑھتے ہوئے تم مر کیوں نہیں گئے؟
قرآن پڑھتے ہوئے تم جل کر راکھ کیوں نہیں ہوئے؟
قرآن پڑھتے ہوئے تم زندہ کیسے رہے؟
قرآن پڑھتے ہوئے تم غافل کیسے رہے
جب تک کہ ڈاکو نے تمھیں لُوٹ لیا۔
قرآن واقعتاً بس انھوں نے پڑھا
جو شب و روز روتے رہے
اور روتے روتے ہڈیوں کا ڈھانچ اور راکھ بن گئے۔

مذکورہ نظم میں موت سے مراد جسمانی موت نہیں بلکہ نفس امّارہ کی موت ہے۔

علم سے متعلق حضرت شیخؒ کا تصوّر ان کے کئی اشعار سے نمایاں ہوتا ہے اور ان کا خیال ہے کہ علم کا حصول نہ دنیاوی مسرتوں اور معاشی مفادات کے لیے ہونا چاہیے اور نہ ہی کوئی سیاسی رتبہ حاصل کرنے کے لیے ؎

افسوس کہ تم لوگ صرف مادّی مفاد کے لیے علم حاصل کرتے ہو
ایک دوسرے کو پھانس لینے کی تاک میں رہتے ہو
دھن دولت اور مقام و مرتبہ کے پیچھے پاگل ہوئے ہو

کوئی مہمان آئے تو تیوری چڑھاتے ہو
تمہیں گمان ہے کہ تم خاص الخاص ہو
لیکن تمہیں معلوم نہیں کہ روز حشر میں تم میں سے کسی کو بھی نجات نہیں ملے گی۔

☆

دانشمند حقیقت میں امرت بیچنے والا ہے
جو قطرہ قطرہ امرت ٹپکاتا ہے
اس کے سامنے کتابوں کے انبار لگے ہوتے ہیں
جن میں وہ سچائی کی تلاش کرتا ہے
لیکن وہ عالم جو دُنیاوی خوشیوں کے لیے پڑھتا ہے
باہر سے نازاں اور اندر سے کھوکھلا ہوتا ہے
اس کے قول اور فعل میں ہمیشہ تضاد ہوتا ہے۔

☆

علم کا حصول صندوق میں سونا بھرنے کی طرح ہے
سودا سیدھی راہ پر قائم رہنا ہے
اور اس میں پونجی لگانا سچائی کو پرکھنا ہے۔
ایمان چراغ کی مانند ہے جسے تیز ہوا سے بچانا ہے
نماز زمین میں بیج بونا ہے ــــ
اپنے نیک برتاؤ اور ادب کے ساتھ اس میں نلائی کر
جب ہی تمہاری فصل پک جائے گی۔

حضرت شیخؒ کی شاعری کشمیریوں کی زندگی اور ان کے مزاج پر جغرافیائی اثرات اور ساتھ ہی اس سیاسی و سماجی ماحول کی عکاسی کرتی ہے جو حضرت شیخ کے اردگرد پایا جاتا تھا۔ زمانۂ قدیم سے کانگڑی کشمیری کلچر کا ایک منفرد و مخصوص اور لاینفک جزو ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ یہاں کے جغرافیائی حالات کے پیش نظر ہر کشمیری ــــ امیر یا غریب، دونوں کے لیے

اپنی ایک رہنے کی جگہ کا ہونا لازمی ہے۔ اسی لیے مکانوں کی تعمیر کا شوق وسودا ہماری سماجی و معاشی زندگی کا حصّہ بن گیا ہے۔ یہ حقیقت بیس مصرعوں پر مشتمل شیخ کی اس نظم سے ظاہر ہے ؎

پَل بھر کا آنا ہے اور پَل بھر کا جانا
کانگڑی مجھے چاہیے اپنے جسم کو گرم رکھنے کے لیے۔
میں نے اونچا مکان تعمیر کیا
لیکن کس لیے؟ آخر مرنا تو ہے!
آنکھوں میں دُھند چھا گئی اور کان بہرے ہو گئے ہیں
ناحق میں نے صاف آسمان پر کیچڑ پھینک دی
(جو واپس مجھ پر ہی گری)
میں نے اپنی ہی لائی ہوئی شامت سے خود کو دھوکا دیا
اب پچھتاتا ہوں لیکن بے کار۔
اِس پار تکلیف و اضطراب میں ہوں
اور اُس پار مجھے کفِ افسوس ملنا ہوگا
میں یہاں سے وہاں اُڑ جاتا
لیکن کیسے کہ میرے پَر ہی نہیں ہیں
مَیں تو ایک قدم جست بھی نہیں بھر سکتا
مَیں تیرتا لیکن سامنے طوفانی 'وُلر' ہے
مَیں نے اپنی آنکھیں اور کان بند کر دیئے
اور یوں سو جانے کے لیے جگہ بنا لی
میری ساری کوششیں رائیگاں ہو گئیں
اے خدا! اب میری ساری امیدیں تیری ہی رحمت سے وابستہ ہیں۔

کشمیر اپنی خوبصورتی، لوگوں کی ذہانت اور صنعت وحرفت کے لیے مشہور ہے۔ یہاں کا "وازہ وان"، اپنے مخصوص پکوان اور ذائقہ کے اعتبار سے منفرد طرز طباخی ہے۔ بعض لوگوں نے وازہ وان میں پیش کی جانے والی مختلف ضیافتوں کی اصل کا تعلق مخواہ مخواہ بعض بیرونی ملکوں کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن کلام شیخ العالم اس تعلق سے سب سے معتبر شہادت فراہم کرتا ہے کہ یہ پکوان کشمیری الاصل ہیں اور 'وازہ' (پیشہ ور باورچی) کا رواج بھی کشمیر میں اتنا ہی پرانا ہے جتنا کہ دوسرے پیشوں کا۔ ذیل کی نظم میں شاعر گوشت کے ان پکوانوں کا تسلی بخش ذکر کرتے ہیں ؎

سات مسالوں سے تیار کیے گئے چاول
اور 'رستے'، کہ جن میں زعفران استعمال کی گئی ہو'
اس طرح کے کھانے سے
فرشتے تک بیمار ہو سکتے ہیں
قلیہ، دو پیازہ، میتھی ماز اور رستہ
— ریشی اور ولی اس طرح کی ضیافتوں کے عادی نہیں ہوتے

ذیل کے قطعے سے مستنبط ہوتا ہے کہ یہاں کے لوگ مہمان نوازی میں اس قدر فیاض تھے کہ معمولی سے معمولی مہمان کو بھی متنوع پکوان کھلانے کے لیے کسی ماہر پیشہ ور باورچی کی خدمات حاصل کرتے تھے۔ ساتھ ہی یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مہمانوں کو بیش بہا تحفہ جات بھی پیش کیے جاتے تھے۔ اس قطعہ کی داخلی ساخت علامتی بھی ہے اور صوفیانہ بھی لیکن اس کی خارجی سطح زیر بحث موضوع سے تعلق رکھتی ہے ؎

میں تمہارے یہاں مہمان بن کر آیا
تم مجھ سے شفقت اور فیاضی کے ساتھ پیش آئے
مجھے تحفہ میں ایک گائے اور بچھڑا عنایت کیا۔
من دولہن ہے اور احساس دولہا
ذہن ہر شے کو مانگتا ہے کہ جو اس کے سامنے آئے

دودھ اور گوشت کے پکوان بہتات میں ہیں
تم میرے وازہ (میزبان) بنو اور میں تمہارا مہمان بنوں
روح اب جسم سے جلد ہی الگ کر دی جائے گی
پھر تم کس کے میزبان اور میں کس کا مہمان!

یوں تو ہمیں اپنے کلاسیکی شعراء سے سماجی شعور کی (بہت زیادہ) توقع نہیں کرنی چاہیے اور وہ بھی وسطی دور کے صوفی شعراء سے، کیونکہ یہ تصور حال ہی کا ہے۔ پھر بھی چند مستثنیات ملتی ہیں اور حضرت شیخ کی شاعری اسی زمرے میں آتی ہے۔ ذکر ہو چکا ہے کہ حضرت شیخ کمیٹڈ شاعر تھے۔ وہ اخلاقی قدروں پر مبنی اور استحصال اور استبداد سے آزاد معاشرے کی تعمیر کے خواہاں تھے۔ اس لیے انھوں نے بالواسطہ یا بلا واسطہ طور پر ہر طرح کے استحصال کے خلاف آواز بلند کی اور استبداد اور عوام کے دکھوں پر تشویش کا اظہار کیا۔

ان کی علامتی نظم "گونگل نامہ" میں اس جانب بعض حوالے ملتے ہیں۔ وہ بے زمین کاشت کار کی بدقسمتی کی تصویر کھینچتے ہیں جو اپنے بال بچوں کے ساتھ اپنے مالک کے کھیتوں پر بے تکان محنت و مشقت کرتا ہے لیکن جب وہ فصل کاٹتا ہے تو زمین دار کے کارندے، چوکیدار اور دوسرے منتظمین اناج کی تقسیم کی بڑی سختی سے نگرانی کرتے ہیں۔ اناج سے بھوسا وغیرہ الگ کرتے ہیں، کسان کو معمولی معمولی بہانوں سے ڈراتے دھمکاتے ہیں۔ زمین دار کا حصہ اس کے حق کے بطور لے جاتے ہیں اور کسان کے حصے کو بھی دھونس، دباؤ اور ایذارسانی جیسے قسم قسم کے حربوں سے ہڑپ کر لیتے ہیں۔ غرض جو سلوک وہ اس کے ساتھ روا رکھتے ہیں اس کی طرف ذیل کے بند میں اشارہ کیا گیا ہے ؎

(زمین دار کے کارندے) تمہاری پکی ہوئی فصلوں کو بھی خام قرار دیں گے
اور تمہاری پیداوار کے ہر دانے کو گن لیں گے
اسے گودام میں بھر کر مہر بند کر لیں گے

یہ نظم شیخ العالمؒ کے زمانے کے زرعی نظام کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اس نظام کے خلاف خود ان کے ردِّعمل کو بھی نمایاں کرتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ معاشرتی و معاشی حالات کے دباؤ

کے تئیں ان کے بھرپور شعور کا بالواسطہ اظہار ہے۔

ایک اور نظم میں کنڈی علاقوں میں رہنے والوں کے جغرافیہ اور جغرافیائی ماحول، سماجی حالات اور معاشی تکالیف کو بیان کرتے ہوئے حضرت شیخ اس صورت حال کے تئیں خود اپنے ردِّ عمل اور احساسات کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ دیہات، جنگلوں کے بہت قریب ہیں اس لیے بڑا ہی دلکش اور جاذب نظر سماں پیش کرتے ہیں، لیکن خشک سالی، قبل از وقت برفباری اور فصلوں کے کچّا رہنے کے باعث ان علاقوں میں رہنے والوں کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ مذکورہ طویل نظم سے ایک بند ملاحظہ ہو ؎

کنڈی علاقوں کی عورتیں
کہ جن کے پاس نہ سر ڈھانپنے کے لیے کچھ ہوتا ہے
اور نہ ہی پہننے کو اونی "پھرن"؛
اس کے باوجود وہ مہمانوں کی خاطر داری کرتی ہیں
ان کی غذا جَو کے آٹے اور معمولی جنگلی پھلوں پر مشتمل ہوتی ہے

پرانے زمانے میں سیلابوں، خشک سالیوں، بے وقت برفباریوں اور قبل از وقت کی سردیوں کے باعث اس شاداب سرزمین میں قحط سالی عام تھی۔ جغرافیائی مجبوریوں اور مواصلات کی کمی کی وجہ سے غذائی اجناس کی درآمد ناممکن تھی۔ ایسے حالات میں قوت خرید رکھنے والے امیر لوگوں کو بھی غذائی اجناس نہیں ملتی تھیں کہ وہ فاقہ زدگی سے بچ پاتے۔ حضرت شیخؒ کہتے ہیں ؎

سونا اور چاندی بھلا کس کام کے
اس سے تو ایک من اناج بہتر ہے

مذہبی رواداری کے تئیں حضرت شیخؒ کی دلبستگی، ذات پات کے بھید بھاؤ کے تئیں ان کا ردِّ عمل اور مذہب کا استحصال کرنے والوں کے خلاف ان کا ملامتی لہجہ ـــ اس سب سے شاعر کی فکر میں سماجی شعور کی مثالیں فراہم ہوتی ہیں۔ اپنے معاشرے کے تضاد کو بے نقاب کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں ؎

(۱)

کچھ ایسے ہیں کہ جن کے گودام سینکڑوں قسم کے اناج سے بھرے ہیں
اناج ۔جو کئی رنگوں کے ہیں ۔ سُرخ ، سفید
اور کچھ ایسے ہیں کہ جو دانے دانے کو ترستے ہیں
اور جن کا اکلوتا بچہ بھیک مانگتا ہے

(۲)

ایک کے دروازے پر گویا نغمہ وساز کی محفل ہے
اور وہ خود مستی میں ڈوبا ہوا ہے ۔
دوسرا وہ ہے جو رسیوں میں جکڑا ہوا ہے
اور بےچارے کو بےرحمی سے پیٹا جارہا ہے ۔

(۳)

ایک وہ ہے کہ جس کے پاس سونے کی اشرفیوں کے ڈھیر ہیں
وہ قرض پر رقم دیتا ہے اور سود کماتا ہے
دوسرا وہ ہے کہ جو حالات سے مجبور ہو کر
دوسرے کے گھر میں نقب لگاتا ہے

کشمیری میں بیانیہ شاعری کو مثنوی کے ارتقاء کے ساتھ ہی فروغ مِلا۔ مثنوی کا آغاز یہاں ۱۹ ویں صدی میں ہوا۔لیکن یہ مسلّمہ حقیقت ہے کہ حضرت شیخؒ کے یہاں اس نوع کی شاعری کے اوّلین اور بہترین نمونے ملتے ہیں ؎

جوئباروں کے کنارے پودینہ سے مہک رہے ہیں
اور پاس کے جنگل چنبیلی کے پھولوں سے لدے ہوئے ہیں
ان کی خوشبو بڑی مسحور کُن ہے، جو دیکھتا ہے داد دیتا ہے،
شہد کی مکھیوں کے چھتّے سفید شہد سے بھرے ہوئے ہیں
کنڈی علاقے واقعی بہت خوبصورت ہیں

کنڈی علاقوں میں اخروٹ بہتات میں ہوتے ہیں
اس قدر کہ ریچھ بھی سب نہیں کھا سکتے
اخروٹ کی گریوں سے کھانے کا تیل بڑی مقدار میں ملتا ہے
کنڈی علاقے واقعی بہت خوبصورت ہیں

چوتھی دہائی کے آخر میں ترقی پسند تحریک کے طلوع ہونے تک اس طرح کی حقیقت نگاری شاعرانہ ندرت تھی۔ مثنوی نگاروں نے اپنا منظوم بیان تخیلی باغوں، داستانوی بادشاہوں کے محلّوں اور رستم کی جنگوں تک محدود رکھا اور اپنے یہاں کے گردوپیش کو بیان کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے علی الرّغم حضرت شیخؒ قرون وسطیٰ میں اپنے گردوپیش کا شعور رکھتے تھے۔

ایک اور نظم مشہور ترکی "یاون مثر" سے مخاطب ہو کر لکھی گئی ہے۔ شاعر نے چند اشعار میں اس رقاصہ کے عین شباب میں اس کی خوبصورتی کا بیان کیا ہے۔

غنائیت ان کی شاعری کی ایک منفرد خصوصیت ہے۔ فارسی زبان و ادب کے اثر کے تحت انھوں نے نئی بحروں، نئے قافیوں اور آہنگ اور تشبیہات و استعارات کو متعارف کیا۔ کشمیری شاعری میں موسیقیت اور نغمگی کا اضافہ کیا۔ ان کی نظم "گونگل نامہ" میں ہمیں سب سے اوّلیں غزل ملتی ہے جو 'وژن' کی ہیئت میں ہے۔ یہ ایک علامتی غزلِ مسلسل ہے۔ آزاد نے بجا طور پر کہا ہے کہ اس کی (گونگل نامہ کی) حدود جدید غزل کی سرحدوں سے ملتی ہیں[1]۔ غنائیت پر بحث کرتے ہوئے یہ ضروری ہے کہ ایسے اشعار کا حوالہ دیا جائے جو تغزل سے معمور ہیں۔

عشق و محبت غزل اور نغماتی شاعری کا مشترک موضوع ہے لیکن اوّل الذکر (غزل) ایک غم زدہ عاشق کے تجربات کا اظہار کرتی ہے اور زندگی کے مابعد الطبیعاتی، فلسفیانہ اور روحانی پہلوؤں کی گہرائی میں اترتی ہے۔ یہ انسان کی فطرت اور اس کے آغاز و انجام کے اسرار و رموز کے بارے میں بات کرتی ہے۔ چنانچہ اس پسِ منظر میں دیکھیں تو حضرت شیخؒ کے 'وژن' کو غزل کی بنیاد کہا جا سکتا ہے ؎

---

[1] کشمیری زبان اور شاعری، جلد دوم، ص ۱۹۷

حضرت شیخ نورالدین ولیؒ

(۱)

میں سُندری کام دیو کے جال میں پھنس گئی!
جب سے میرا شباب پھولوں کا متوالا ہو گیا
میرا وہی حال ہو گیا
جو چوٹیوں کی برف
اور رو کر کی آندھی کا ہوتا ہے
مجھے بھاگتے ہوئے ٹھگ نے لُوٹ لیا
لذیذ چاول میرے لیے کنکر اور بھوسہ بن گئے
اور کرب کا ایک ایک دن
مجھ غریب کے لیے سال کے برابر ہو گیا۔

(۲)

خُدا نے تجھے عشق کا غم بخشا ہے
اپنے لہو سے اس کی پرورش کر
یار کو نہ دیکھوں تو جیوں کیسے
یار کو یار کی بات کرتے رہنا چاہیے۔

میری چھٹی حس جاگی جب میں چھ بنوں میں سے گزرا
اور میرے صبر سے میرا ضمیر بیدار ہو گیا
میں نے آتشِ عشق میں اپنا جگر سینک لیا ہے
عشق میرا محبوب ہے اور میں اسے ہمیشہ ساتھ رکھتا ہوں
ایک نفس سے یہ ٹھنڈا پڑ جاتا ہے
اور اس ایک نفس سے یہ دوبارہ گرمی پا لیتا ہے
اُس کا وجود ان ہی دو سانسوں کے بیچ اٹکا ہوا ہے

عاشق اپنے محبوب کی خوشی کے لیے سب کچھ قربان کر دیتا ہے

یہ ایک دوسرے سے اسی طرح جڑے ہوئے ہیں
جیسے پھول کی پتیوں کے ساتھ خوشبو
جو اس نواح سے باخبر ہوگا
یقیناً اُسے اپنے محبوب کا وصل حاصل ہوگا

(۳)

محبوب تک رسائی اس قدر آسان نہیں
کہ اس سے سودا طے کر سکوں
افسوس! کہ اس نے شمشیر کی ضربوں سے
میرے جگر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے
اس نے میرے دامن میں انگارے بھر دیئے ہیں
اور میں اُف تک نہ کر سکا
میرے جسم کا انگ انگ اس آگ میں خاکستر ہوگیا ہے
میرا جسم زخموں سے چوُر ہے

ذیل کی غزل میں شاعر کا انداز علامتی بھی ہے اور متصوفانہ بھی۔ اس کی ہیئت نہ فارسی غزل کی ہے اور نہ ہی کشمیری "وژن" کی۔ یہ شعری تخلیق دس بندوں پر مشتمل ہے اور ہر بند کے چار مصرعے ہیں جو "الف"، "ب" کی صورت میں ہیں۔ ہر بند کا پہلا مصرعہ تیسرے مصرعے سے اور دوسرا چوتھے مصرعے سے ہم قافیہ ہے ؎

منصور تاب نہ لا سکا
اُس کے اک ذرا جلوے کی۔
اس نے صبر کو سرے ہی سے اُکھاڑ پھینکا
اور یوں راز کی بات برسرِ عام آگئی
وہ دریا کی ایک موج تھا
لیکن اپنی شناخت قائم نہ رکھ سکا

وہ حقیقت کے بہت قریب تھا
لیکن افشائے راز کیا اور راستے سے بھٹک گیا
وہ آگ میں ختم نہیں ہوا
اسی لیے عارف اور عاشق روئے
وہ منصور تھا اس لیے مرا نہیں
اس نے خود ہی اپنی خوشبو خاک میں ملا دی
خود کو سنگسار کروایا اور کوڑے لگوائے
جبھی تو شریعت کا باندھ قائم رہا۔
وہ عاشقوں اور عارفوں کی زینت تھا
اس کی اندر کی آواز باہر کیسے آ گئی
اس نے خود شریعت کے باندھ کو توڑ دیا
اور جو راز تھا وہ عام ہو گیا۔
معشوق نے جب اسے درشن دیئے
اور اسے شرابِ شوق پلا دیا
تو چور کی طرح سزا دلوائی
دریا میں سے اس نے ایک قطرہ دیکھا
اس میں کود پڑا اور لعل و جواہر نکال لایا
عشق کا تیر اس کے سینے میں پیوست ہو گیا
اِس کا درد برداشت کیا اور محبوب کو پا لیا
اس نے اپنا بدن زعفران اور کافور سے دھو لیا
اور یوں دار کو مشکبار کر دیا
اس نے عاشقوں اور عارفوں کو راہ دکھائی
اور یوں دنیا بھر میں شہرت پائی۔

اس غزل میں شاعر نے منصور کے مشہور واقعہ کو مختلف جہتوں کے ساتھ بیان کیا ہے اور یوں اس ایک واقعے سے کئی ابدی اور سچّے نتائج اخذ کیے ہیں۔ یہ بات باعث افسوس ہے کہ موضوع اور مواد کے تسلسل کی حامل دس بندوں پر مشتمل یہ طویل غزل[1] حال ہی میں الگ الگ قطعات میں تقسیم کی گئی ہے جب کہ کلام شیخؒ کے فاضل مرتبین بابا کمال اور بابا خلیل دونوں نے ان تمام اشعار کو ایک ہی 'نظم' کے عنوان کے تحت ترتیب دیا ہے۔

اس خاص موضوع سے متعلق اشعار کا حوالہ دینا حد سے زیادہ طوالت کا باعث بنے گا۔ تاہم حضرت شیخؒ کی اس نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں جو انھوں نے رقاصہ "یادن مَتری" سے مخاطب ہو کر کہی ہے ؎

تو گھنے جنگل میں حسین وجمیل راہبہ کی طرح آئی تھی
تمہارے ساعد سیمیں بہت ہی پرکشش تھے
اب سوکھے گھاس کی طرح تجھے زوال آگیا ہے
اے یادن مَتری تو ایک دن پچھتائے گی

کلام شیخؒ میں شعری ایہام بھی نمایاں ہے جس کا اندازہ محولا بالا غزلوں سے ہوا ہوگا۔

ایک اور قطعہ میں شیخ 'عروج وزوال' کے سادہ اور عام خیال کو پیش کرتے ہیں لیکن آخری مصرعے میں انھوں نے اسے وہ موڑ دیا ہے کہ اس کے مفہوم کا دائرہ وسیع تر ہو جاتا ہے شاعر نے بڑے خلوص سے قاری کو وہی تاثر قبول کرنے کو کہا ہے جو ایک خاص تجربے نے خود شاعر کے ذہن پر چھوڑا ہے۔ اس کا آخری شعر ایک عام اور اکثر دہرائے گئے خیال کو بالکل نیا اور تازہ بنا دیا ہے ؎

رئیسوں کے وہ شاندار محل
جن کی چمک دمک حسینوں کو ماند کر دیتی تھی
جہاں خوبصورت عورتیں رسیلے گیت گاتی تھیں
اور مور پنکھوں سے جھاڑو دیتی تھیں

---

[1] ہیئت کے اعتبار سے اس شعری تخلیق کو غزل کہنے کے سلسلے میں مصنف کے ساتھ اختلاف کرنے کی گنجائش ہے۔ (مترجم)

آج وہاں ویران اور کھنڈر ہے جس میں کپاس کی فصل کاٹی جاتی ہے

اے نصر! میں نے دیکھ لیا، اب تو جاکے دیکھ۔

ایک اور نظم میں شاعر نے پیڑ کی زبان سے اس طرح کہلوایا ہے (پیڑ اپنی حالتِ زار پر افسوس کرتا ہے اور کہتا ہے) ؎

افسوس کہ میں تباہ ہو گیا ہوں

تنہا چھوڑا ہوا، بے حس و حرکت۔

کاش میں آدمی ہوتا

تو ان سبزہ زاروں میں گھومتا پھرتا

اور میں نے اس دنیا کو اپنا گرویدہ بنا لیا ہوتا۔

لیکن افسوس کہ میں وہ نہیں ہوں

اور اس لیے دور صحرا میں پڑا ہوا ہوں

اس کے باوجود کہ حضرت شیخ نے شاعری کو سماج میں تبدیلی لانے کے لیے ایک ذریعہ بنایا انھوں نے شعر کے فنی پہلوؤں کو بھی بحال رکھا اور کشمیری شاعری کے ارتقاء میں ایک اہم رول ادا کیا۔ اس وجہ سے آپ کے جملہ اشعار، بغیر کسی استثنٰی کے، شعری محاسن کی عمدہ مثالیں ہیں۔ وہ نادر تشبیہات استعمال کرتے ہیں، کمال فنکاری سے نئے اشعار تخلیق کرتے ہیں، الفاظ و تراکیب وضع کرتے ہیں اور اپنے اشعار میں شعوری طور پر موسیقی کی خوبیوں کا اضافہ کرتے ہیں۔ ان کے جن اشعار کو کشمیری زبان میں ضرب الامثال کا رواج ملا ہے انھیں بیان کرنے کے لیے ان کے مجموعی کلام کے ایک تہائی حصہ کا حوالہ دینا پڑے گا۔ وہ ایک ہی لفظ کو کئی کئی معنوں میں استعمال کرتے ہیں اور ایہام کی اس صنعت سے اپنی شاعری کے حسن کو دوبالا کرتے ہیں۔

ذیل کی نظم میں تشبیہات و استعارات کا استعمال ملاحظہ ہو ؎

جھٹ پٹا ہوتے ہی میری کانگڑی میں انگارے بجھ گئے

ابھی تک میں نے چولہا سلگایا نہیں

اب میں اس کانگڑی میں کیا بھر دوں۔
اناج کے ڈھیر کو چھوڑ کر میں کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر ریجھتا رہا
میں نے ناحق دن رات کی محنت اس پر لگا دی
سونا چاندی چھوڑ کر میں نے پیتل کو اپنایا
تلوار کو توڑ اس سے درانتیاں بنالیں
شروع بہار میں جو کچھ میں نے بویا
خزاں کے موسم میں اسی کی فصل کاٹی
دن ڈھل گیا تو میں نے چولھا سلگانا چاہا
لیکن افسوس کہ یہ بُجھ گیا ہے
اور میرا کھانا تیار ہونے سے رہا۔

☆

تمہارے نیچے گہری کھائی ہے
اور تم اس کھائی کے اوپر سے رقص کرتے ہو
بھلا تمہاری عقل اس بے فکری پر کیوں کر مطمئن ہے؟

☆

پرنالوں میں لعل ملتے نہیں
دام میں گرفتار پرندے چہچہاتے نہیں
گندگی میں نرگس کھلتے نہیں
اور نہ ہی شیشہ گروں کے پاس موتیوں کے ہار مل سکتے ہیں۔

اس طرح کے شعری محاسن اور تشبیہات و استعارات کو کسی دوسری زبان میں پیش کرنا بہت مشکل ہے۔ حضرت شیخؒ کے وضع کردہ استعارے حسب ذیل ہیں:

☆ دُنیوی عیش و آرام کے لیے "سوکھی گھاس کے ڈھیر کے اندر لگی ہوئی آگ"
☆ علم کے لیے "خوشبو کا ظہور"

☆ عیش وعشرت کی دُنیا کے لیے "گھاس سے ڈھکی ہوئی خندق"
☆ انسانیت کی قدروں کے لیے "ہیروں کا انمول خزانہ"
☆ تکبّر کے لیے "بے ثمر پیڑ"
☆ عجز وانکسار کے لیے "پھلوں کے بوجھ سے جھکا ہوا پودا"
☆ دنیا کے شیدائی عالم کے لیے "کتابوں سے لدا ہوا خچر"
☆ موت کے لیے "خونخوار چیتا" یا "پھلوں کا لذیذ رس"
☆ حقیقت مطلق کے لیے "بازار کو سجانے والا بیوپاری"
☆ روح کے لیے "مہمان"
☆ جسم کے لیے "پٹّے پر دی ہوئی عمارت"
☆ جوانی کے لیے "ماہِ کامل"
☆ بڑھاپے کے لیے "ٹوٹا ہوا پہیّہ" وغیرہ وغیرہ

شیخ العالمؒ نے نہایت فن کاری کے ساتھ شاعری میں ضدین کے استعمال کی نادر کاری متعارف کی ہے ؎

اسپِ تازی اور ٹٹّو برابر نہیں ہیں
لکڑی کا ٹب اور کشتی برابر نہیں ہیں
مینڈک اور مگرمچھ برابر نہیں ہیں
راج ہنس اور کوّا برابر نہیں ہیں

☆

کچھ ایسے ہیں کہ پیدا ہی نیک اور پارسا ہوتے ہیں
انھوں نے ذرا سی آبِ جُو میں ہی دریا کی وسعت پائی
کچھ ایسے ہیں جو مَے سے مدہوش ہو کر آسمان کو تک رہے ہیں
اور ان کے ہرے بھرے کھیت ٹڈی دَل تباہ کر گئے
کچھ ایسے ہیں کہ رقم لگائے بغیر ہی منافع کمایا ہے

اور کچھ ایسے کہ جو پریشان حال ہیں
اور مایوسی میں اپنی دکانیں بند کر چکے ہیں

بذلہ سنجی سے معمور طنز اور گہری تعریض۔ بے بھرپور ظرافت ان کی شاعری کی منفرد خصوصیات ہیں، ایسی خصوصیات کہ جو ان کے بعد سے ۱۹ ویں صدی کے اواخر تک کی شاعری میں کافی حد تک مفقود رہیں۔ مُلّا، برہمن، ریاکار ریشی اور درویش ان کی طنز و تعریض کے خاص ہدف تھے۔ ذیل کے قطعات میں مُلّاؤں اور برہمنوں ہر دو کا تمسخر اڑایا گیا ہے ؎

لمبی لمبی رنگی ہوئی داڑھی والے یہ مُلّا
میں نے انھیں بہت باتیں بناتے ہوئے پایا
واہ رے ان کی باتیں
— یہ تو جھوٹے ہیں۔ ان کی باتوں کا کیا بھروسہ

☆

مُلّا مسجدوں کے بیوپاری بنے ہیں
پنڈت مندروں سے مورتیاں چرا تا ہے
ان میں ہزاروں میں ایک کو نجات ملے تو ملے
ورنہ یہ سب شیطان کے چیلے ہیں۔

☆

ملّا گوشت کھانے کا شوقین ہے
ساگ سبزی کو گھاس پھوس کہتا ہے
مرغن غذائیں کھانے اور ڈکارنے کا عادی ہے
اور مسجد کے بارے میں کہتا ہے
کہ وہاں یکسُو رہتا ہے۔

☆

ہوا کی زد پر پیڑ کے پتّے کی طرح

یہ موٹا ملاّ دعوت کے لیے دوڑ پڑے گا
وہ پیٹ بھر گوشت کھائے گا اور شوربہ پیے گا
اِس میں ذرا سی کمی ہو تو ناراض ہو گا

اس قطعہ میں مُلاّ، شیخ اور صوفی — تینوں کو یکساں قرار دے کر ایک ساتھ بے نقاب کیا گیا ہے ؎

ملاّ نذر و نیاز اور دعوتوں سے پھولے نہیں سماتے
شیخ مال و دولت کے پیچھے پاگل ہیں
خرقہ پوش صوفی دوسروں کو دھوکا دینے پر خوش ہوتے ہیں
— انھیں کھانے میں ایک من گوشت اور پلاؤ چاہیے۔

پنڈت کا مذاق اس شعر میں اُڑایا گیا ہے ؎

بوڑھے اور نحیف و نزار پنڈت کو
تلاش ہوتی ہے کنواری لڑکی کی
جسے وہ بیوی بنا لے۔
وہ اپنی چِتا کے قریب بھی ہو
تب بھی کسی بیوہ سے شادی نہیں کرے گا

ایک بار حضرت شیخ ایک حجّام سے ملے جس نے ان کا سر مونڈھ لیا۔ شیخؒ نے دیکھا کہ حجّام کا استرا اور قینچی دونوں زنگ آلود ہیں۔ انھوں نے حجّام کا نام پوچھا اور حجّام نے جواب دیا "جناب میرا نام شراون[1] ہے"۔ "شراون" جون کے مہینے سے مطابقت رکھتا ہے۔ حجام کے نام سے جوانی، خوشحالی اور اَوجِ کمال ظاہر ہوتی تھی۔ 'پوہ' کا مہینہ (مطابق دسمبر، جنوری) بڑھاپے، بے حد مفلسی اور زوال کی انتہا کے مترادف ہے۔ حجّام نے اپنا نام بتایا تو حضرت شیخ نے اسے اوپر سے نیچے تک گھور کر دیکھا اور کہا ؎

---

[1] ساون کا مہینہ (۱۵؍جولائی سے ۱۵؍اگست تک) مترجم

میں ہَوا کے ساتھ سفر میں تھا
شرادن نے میرے سر کو مونڈھ لیا
کوّوں نے میرے بدن کو نوچا
مجھے کوئی منافع نہ مِلا لیکن تم بھی نقصان میں نہیں رہے
جا تمارے یہ اوزار (استرے وغیرہ) کھو جائیں
تم تو ''پوہ'' ہو لیکن نام 'شرادن' ہے۔

شاعر نے بعض مخصوص الفاظ کو ان کے لغوی معنی کی بجائے مختلف معنوں میں استعمال کیا ہے۔ الگ الگ موقعوں پر الگ الگ معنوں میں ان کے مکرّر استعمال سے ان الفاظ کا معنوی دائرہ وسیع ہو گیا ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ان الفاظ کو علامتوں کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔

کلام شیخؒ اسلامی دنیا اور کشمیر، ہر دو کے تاریخی واقعات اور شخصیات کے حوالوں سے بھرا پڑا ہے۔ اسی طرح انھوں نے ماحولیاتی پیچیدگیوں اور دیو مالائی واقعات کے بھی متعدد حوالے دیے ہیں۔ اختصار کے پیش نظر ان میں سے چند ایسی شخصیات کے نام لیے جاتے ہیں کہ جن کا حوالہ انھوں نے کہیں کہیں دیا ہے۔ یہ ہیں ڈنڈک ون کے رام، ارجن کی بہادری، پانڈوؤں کا عروج و زوال، حضرت نوحؑ، حضرت خلیلؑ، شدّاد، حاتم طائی، سکندر، فرعون، مولانا رومی، حضرت اویس قرنیؒ، شیخ برسیا، شیخ ثناء، سدّھا شری کنٹھ، لل عارفہ وغیرہ۔

کلام شیخؒ ہمارے لیے چودھویں صدی کے کشمیر کی سماجی و تمدّنی زندگی کے بارے میں معلومات کا ایک قیمتی خزانہ ہے۔ اس کی وضاحت کے لیے یہاں مزید کچھ اشعار کا حوالہ دیا جاتا ہے ؎

تینوں ایک ہی دھات یعنی تانبے کے بنے ہیں
اور تینوں پر ایک ہی کاریگر نے کندہ کاری کی ہے
لیکن تھالی کے مقدّر میں لذیز پکوان ہیں
بڑے کاسے کے مقدّر میں پلاؤ
جبکہ اُگالدان کی قسمت میں تھوک

اس قطعہ سے ظاہر ہے کہ حضرت شیخؒ کے زمانے میں تانبے کے برتنوں کا استعمال عام تھا یہاں تک کہ اُگالدان بھی اسی قیمتی دھات سے بنائے جاتے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ گھروں میں مٹّی کے برتن بھی استعمال ہوتے تھے جس کا اندازہ اس قطعہ سے ہوتا ہے ؎

مٹّی ہی میری بنیاد ہے اور مٹّی ہی میرے آس پاس
مٹّی ہی میرے اندر ہے اور مٹّی ہی میری منزل
مٹّی میرے وجود کا جز و لاینفک ہے
اور مٹّی کے برتن میرے کھانے پینے کے لیے استعمال ہوتے ہیں[1]

حضرت شیخؒ کے دور میں ان بچّوں کی پرورش بھی دائیاں کرتی تھیں جو متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان دنوں سجاوٹ والے چوبی پنگوڑے اشیائے ضروریہ میں تھے ؎

پیدا ہوئے تو پنگوڑوں میں پالے گئے
دائیاں ان کی پرورش کے لیے رکھی گئیں
بڑے ہو گئے تو غیر محرموں کے پیچھے دیوانے ہو گئے
بوڑھے ہوئے تو وہیں پہنچے جہاں اپنے کرموں نے لیا۔

ذیل کا قطعہ امیروں اور غریبوں، ہر دو کے کھانے پینے کے معیار کی عکاسی کرتا ہے ؎

نثار ہیں کانگڑی اور خرقہ پر
جنھوں نے مجھے سردی سے بچایا
نمکین کنج میرا من بھاتا ہے
جو مری بھوک کا دفاع کرتا ہے

---

[1] کشمیری میں یہ قطعہ جس صورت میں مترجم کو ملا اس کا ترجمہ یوں ہے ؎

مٹّی ہی سے آدم کو پیدا کیا — مٹّی ہی اس کے آس پاس ہے
مٹّی ہی سے ساری نعمتیں اگائیں — جن برتنوں میں کھانا پکاتے ہیں وہ بھی مٹّی کے ہیں۔

(مترجم)

مجھے دودھ کی ملائی اور قند و نبات کی کیا ضرورت
میرے لیے ساگ پات اور خود رو سبزیاں
شہد سے بھی لذیز ہیں۔

مندرجہ ذیل اشعار کشمیر کے طرزِ لباس اور طرزِ تعمیر کی عکاسی کرتے ہیں ؎

اس بارش اور کیچڑ کا کیا کریں
عصا اور گھاس کے جوتے ہر وقت نہیں ملتے
قدم اٹھاتے ہیں تو پاؤں کیچڑ میں دھنس جاتے ہیں
روح کو بھی قرار کہاں!
یہ خوبصورت چوبی برآمدہ گر کر خاک میں مل جائے گا
پھر یہ دنیا دوبارہ کہاں آباد ہو گی؟

اس متصوفانہ شعر پارے میں شاعر نے بارش اور کیچڑ کو علامتوں کے بطور استعمال کیا۔ بارش اور کیچڑ کی صورت میں سیدھے کھڑے ہو کر چلنے کے لیے لاٹھی ایک شئے ضروریہ ہے۔ برفیلی راہوں پر چمڑے کے جوتے پہن کر مشکل ہی سے چلا جا سکتا تھا اس لیے گھاس کی رسّی سے بنائے گئے جوتوں (پلہور) کی ضرورت پڑی۔ مکان کی اوپری منزل میں کندہ کی ہوئی لکڑی سے بنا ہوا برآمدہ "زالی ڈب" کہلاتا تھا۔

جیسا کہ ذکر ہوا ہے نظم "گونگل نامہ" میں شاعر نے کسانوں کی حالت بیان کی ہے۔ یا ون مترسے مخاطب نظم میں انھوں نے بالواسطہ طور پر اپنے وقت کے زعماء کی دھوکا بازی اور فریب کاری پر تبصرہ کیا ہے۔ کنڈی علاقوں کی حالت زار کی عکاسی کرنے والی نظم میں شاعر نے ان علاقوں کے خوبصورت گرد و پیش کی تصویر کھینچی ہے لیکن ساتھ ہی یہاں کے عوام کی غربت اور مفلسی کا بھی ذکر کیا ہے۔ دوسری نظموں میں بھی انھوں نے بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر اپنے معاصرین کے عادات و اطوار پر تبصرہ کیا ہے۔

حضرت شیخؒ اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ انھوں نے اپنے معاشرے کی بہبود اور اس کی ترقی میں جو کردار ادا کیا، اسے سمجھنے اور اس کا اندازہ کرنے کی صلاحیت اس معاشرے میں نہیں۔

انھیں اُن ہم وطنوں پر ترس آتا ہے جنھوں نے صحیح تناظر میں ان کے رول کی قدر نہ کی۔
اپنے اس تجربے کا خلاصہ انھوں نے اس قطعہ میں بیان کیا ہے ؎

موسمی نالوں کے طاس میں ایک چشمۂ خوش آب کھو گیا
چوروں کے بیچ ایک صوفی منش،
جاہلوں کے بیچ ایک ودوان پنڈت کھو گیا
کوّوں کے بیچ ایک راج ہنس،

آخر پر حضرت شیخ نورالدینؒ کی بعض منتخب نظموں، غزلوں اور قطعات کا ترجمہ پیش خدمت ہے۔

نظمیں

(۱)

میرا خوبصورت اور گورا بدن غلاظت اور گندگی سے داغ دار ہو گیا
چہچہانے والا پرندہ (زاغ) باغ میں سے اُڑ گیا
ہاڑ (جون) کی گرمی پوس اور ماگھ (دسمبر) کی سردی میں تبدیل ہو گئی
جسم کا ہر عضو اب سن پڑ گیا ہے اور انگ انگ گھل سڑ گیا ہے
گناہوں کے بھاری بوجھ سے کمر خمیدہ ہو گئی ہے
میٹھے اور لذیذ پکوان کھا کر میرا دل سیاہ ہو گیا ہے
افسوس کہ میں تباہ ہو گیا، اس کے لیے کسے قصور وار ٹھہراؤں؟

(۲)

راج ہنس کی طرح میں نے اُڑان بھرنا چاہی کہ رفعتوں کو چھو لوں
لیکن اس دنیا نے مجھے اُلو بنا دیا

کوّے اور چیل مجھ پر طعنہ زن ہوئے
گڈریا زادوں نے مجھے گھیر لیا اور مزے لے لے کر مجھے چھیڑتے رہے
میرے شہپر جواب دے گئے اور خزاں کے پتّوں کی طرح گر گئے
اور میرا سونا کانچ کے ٹکڑوں سے بھی ارزاں ہو گیا
کانپتا ہوں کہ پل سراط کو پار کیسے کروں
کہ جس کے نیچے آگ کا دریا بہہ رہا ہے۔
یہ سفید بال سڑے ہوئے پتّوں کی طرح جھڑ جائیں گے
اور یہ دہکتی ہوئی آگ ٹھنڈی پڑ جائے گی
اس کے بعد ایک ابدی نیند مجھے اپنی آغوش میں لے لے گی۔

غزلیں

(۱)

اے بندے! تم موہ مایا کے پیچھے دیوانے ہو گئے ہو
لیکن دکاندار کی طرح نرمی کا ڈھونگ رچا رہے ہو
نفس نے تمھاری آنکھوں پر پٹّی باندھ رکھی ہے
اور یہ تجھے دن بھر کٹھ پتلی کی طرح نچاتا ہے
تمھیں غلاظت کے ڈھیر پر جھپٹنے پر مجبور کرتا ہے
حیف! کہ تجھ میں ذرا بھر بھی عقل نہیں ہے
تمھارے بدن سے بدبو آتی ہے
اور تمھارا وجود شراب کی بھٹّی بن گیا ہے
تمھارے کنویں میں مردہ کُتّا گرا ہے

اس کا پانی صاف کیسے ہو سکتا ہے ؟
دوُدھ میں نجاست ملاتے ہو
کیا تم اس کا ایک قطرہ بھی پی سکتے ہو
بلّی کی طرح تُم شیر کے چنگل میں ہو
میری بات کو غور سے سُن
اپنی اس سمجھ پر تھوک دے
کہ جس کے باعث تم بالکل لاعلم ہو
اس طوفان میں نوحؑ کی کشتی کو پکڑ لے
ورنہ اس گہرے پھیلے سمندر کو پار کرنا تمارے بس کی بات نہیں ۔

(۲)

دنیاداری ٹھیک ہے
لیکن افسوس کہ موت تمارؔی تاک میں ہے
تم گدھے کی طرح ہو اور خود کو شیر سمجھتے ہو
اے آدم فانی ! تمارؔی زندگی فقط ایک سانس کی ہے
یہ دنیا تو فریب اور دھوکہ ہے

☆

ناحق تم اپنے ہونے پر اتراتے ہو
تم نے زندگی پیٹ بھرنے میں صرف کی
آتے ہوئے تم خوشی سے پھولے نہیں سمائے
لیکن جاتے ہوئے
دُکھ اور افسوس کے سوا تمارے دامن میں کچھ نہیں
یہ دنیا تو فریب اور دھوکہ ہے

تمہارے آگے پیچھے گہری اندھیری کھائیاں ہیں
دنیا لرز رہی ہے
اور دریا کا ساحل دلدل والا ہے۔
یہ دنیا تو فریب اور دھوکہ ہے

☆

تمہاری جھیلیں کنول کے پھولوں سے کھلکھلا رہی ہیں
اور کنارے سوسن سے لدے ہوئے ہیں[1]
تمہارے کھیتوں میں زعفران کھل اُٹھی ہے
لیکن افسوس کہ پوس کے مہینے میں یہ سب کچھ ختم ہونے والا ہے۔
یہ دنیا تو فریب اور دھوکہ ہے

قطعات

جب تک دھوپ ہے اور دن نہیں ڈھلتا
خلوص اور لگن کے ساتھ کوئی کام کر
لوگوں سے لڑ جھگڑ کر تم نے ایوان اور عمارتیں تعمیر کی ہیں۔
شہد کی مکھیاں چھتّوں میں شہد جمع کرتی ہیں
اور آخر کار پرندے آکر یہ سب کچھ کھا لیتے ہیں

☆

اپنے بدن کو مت چمکا دے
اس صابون سے میل کچیل دور نہیں ہوگا

---

[1] "اور جھاڑیاں پھولوں سے لدی ہوئی ہیں" (بمطابق کلیات شیخ العالم) — مترجم

جو دن میں پانچ بار نلائی کرتا ہے
وہی خدا کو دیکھ سکتا اور صبر و سکون کے ساتھ رہ سکتا ہے۔

☆

'نر' بھکشا مانگتا ہے' نارائن' بھکشا مانگتا ہے
ایشور اپنے ہاتھ میں کشکول لیے بھکشا مانگتا ہے
'ڈنڈک ون' کا راجہ رام بھی بھکشا مانگتا ہے
ہم غریب اگر بھکشا مانگتے ہیں تو اس میں شرم کیسی؟

☆

سیدھی راہ آیا، سیدھی راہ چلا جاؤں گا
کج فطرت میری سادگی کا کیا بگاڑے گا
مجھے اس (ابلیس) نے روزِ ازل ہی پہچان لیا تھا
اب مجھ واقف کار کو وہ کیا ضرر پہنچا سکتا ہے۔

☆

اِس پَل گھر اور اُس پَل بے گھری
اِس پَل ساتھ اور اُس پَل تنہائی
اِس پَل پانچ پانڈوں کی راج کرتی ہوئی ماں
اُس پَل کمہار کے گھر میں پناہ کے لیے اُس کا گڑگڑانا

☆

وہ خود ہی قصاب ہے اور خود ہی خریدار
وہ خود ہی خود سے حساب طلب کرتا ہے
وہ خود ہی گوشت ہے اور خود ہی چھری

☆

وہ جو یہاں ہے وہی وہاں بھی ہے

وہی ہے کہ کائنات کا ہر ذرّہ جس کے وجود کا مظہر ہے
وہی پا پیادہ بھی ہے اور وہی رتھ سوار بھی
کائنات میں وہی رسا بسا ہے، نظر اُٹھا اور دیکھ!

☆

برداشت کرنا ہے، بجلی کا کڑکنا اور گرنا
برداشت کرنا ہے، دوپہر کا گھُپ اندھیرا
برداشت کرنا ہے، کوہِ الوند بانہوں میں اُٹھانا
برداشت کرنا ہے، ہتھیلی پر دہکتے انگارے سنبھال کر لے جانا
برداشت کرنا ہے، خود کو چکّی میں پسوانا
برداشت کرنا ہے، ایک خروار زہر نگل جانا

☆

کون گیا ہے اور کس نے اُسے دیکھا ہے
کون ہیں وہ جو اس کی تلاش پر قائم ہیں
تن دہی اور لگن سے جو اس کام پہ لگا
وہی منزلِ مقصود کو قریب پاتا ہے

☆

وہ کہ جس نے
کھٹّا میٹھا، تلخ اور زہر ہلال
اور اپنے جگر کا لہو پی لیا
جس نے صبر کیا اور تکلیفیں برداشت کیں
وہی اپنی منزلِ مراد تک پہنچتا ہے

☆

پَل بھر میں خدا کی شان تمہاری تقدیر بنا دے گی

تماری سوکھی شاخوں پر پھر سے بہار آئے گی
سیمرغ قدرت کو محبوب تر رہا
اسی لیے اس نے خود تنہائی اختیار کی
کڑھائی میں اُبلتا ہوا مذبوح ہنس بھی
ذکرِ خدا میں محو ہوتا ہے
پھر ایک بندہ اپنے مالک کو کیونکر بھول سکتا ہے ؟

☆

اپنی جھولی کو عشق سے بھر
تمارے اندر کی بُلبُل چہچہا اٹھے گی
اس بندر پر ندرے پر اپنے پنجرے کو قربان کر
اور جو کل کرنا چاہتے ہو سو آج کر

☆

عشق کی آگ کی لپٹوں پر
اپنے سونے کو کڑھائی میں پگھلا دے
اس میں اپنا دائمی نفس بھر دے
تیزاب کی مدد سے اُسے پیتل سے الگ کر دے
پھر دیکھ کر تمارا سونا چمک اٹھے گا

☆

گنتی کی حدود کو توڑ کر
لاحد نے لامتناہی کو زینت بخش دی
اگر سب مِل جُل کر ایک ہی راہ پر چلیں
تو پھر بھٹکنے کا سوال کہاں !

ذیل کی نظم میں شاعر نے جنّت کی تصویر کھینچی ہے، جنّت، جو خدا کے سچّے بندوں کا مسکن ہے اور امن وسکون کی ابدی آرام گاہ۔

جنّت

(سورگس برہ پیٹھ)

جنّت کی مٹّی سونا ہے اور اُس کی دوُب زعفران
بندے اگر اس کی آرزو ہے تو عملِ صالح کر
جنّت کے دروازے پر درخت طوبیٰ ہے
جو جنّت کو نور آگیں بناتا ہے
اس کے پتّوں پر کلمہ لکھا ہوا ہے
اس کی شاخیں چاندی ہیں اور تنا سونا
اس کے نیچے ایک بڑا چشمہ اُبل رہا ہے
جس کا پانی خالص دودھ کی مانند صاف وشفّاف ہے
اگر تمھیں شوق ہے تو اپنے اعمال سے اسے قند وشکر بنادے
اس (چشمہ) کے کنارے لعل، یاقوت اور زمرّد ہیں
اور ان میں پتھّروں کی جگہ گہر چمک رہے ہیں
خدا کے بندوں کے لیے نشستیں آراستہ ہیں
اور ان پر لعل وگہر نچھاور کیے جاتے ہیں
وہ بہت ہی دانا ہیں اور بہت ہی منافع میں بھی
ان ہی کو خدا کا جلوہ نصیب ہوگا۔
ستارے اپنی اپنی تابانی کا بھرپور مظاہرہ کریں گے
لیکن کرّوفر ہوگا تو آفتاب کا۔

☆

کشمیر کے عظیم صوفی بزرگ حضرت شیخ نورالدین ولیؒ اپنے گہرے اور اعلیٰ افکار کے باعث وادی بھر میں نُند ریشی کے نام سے مشہور ہیں۔ آپ کشمیری نظم کے موجد ہیں اور کشمیر میں اُس ریشی مسلک کے بانی بھی کہ جس نے کشمیری زبان وادب پر غیر معمولی اثرات مرتسم کیے ہیں۔

آپ نے کشمیری شاعری میں عروض و قوافی، آہنگ اور امیجری کی نت نئی صورتیں متعارف کیں۔ شگفتگی بذلہ سنجی اور مزاح سے معمور، نیز انسان کے تئیں آپ کے ہمدردانہ رویّہ کے باعث خوشگوار طنز آپ کے کلام کی منفرد خصوصیت ہے۔

غلام نبی گوہر (پیدائش ۱۹۳۴ء)، جموں و کشمیر میں ڈسٹرکٹ اور سیشن جج رہے ہیں۔ وہ ناول نگار بھی ہیں اور نقّاد بھی۔ ۱۹۷۰ء اور ۱۹۷۵ء میں انھیں ریاستی اکادمی ایوارڈ سے نوازا گیا اور ۱۹۸۷ء میں جموں و کشمیر بسٹ بک ایوارڈ بھی دیا گیا۔

پندرہ روپے ۱۵/

ISBN-81-260-0117-8

کشمیر کے عظیم صوفی بزرگ حضرت شیخ نورالدین ولیؒ اپنے گہرے اور اعلیٰ افکار کے باعث وادی بھر میں نُندریشی کے نام سے مشہور ہیں۔ آپ کشمیری نظم کے موجد ہیں اور کشمیر میں اُس ریشی مسلک کے بانی بھی کہ جس نے کشمیری زبان وادب پر غیر معمولی اثرات مرتسم کیے ہیں۔

آپ نے کشمیری شاعری میں عروض و قوافی، آہنگ اور امیجری کی نت نئی صورتیں متعارف کیں۔ شگفتگی بذلہ سنجی اور مزاح سے معمور، نیز انسان کے تئیں آپ کے ہمدردانہ رویّہ کے باعث خوشگوار طنز آپ کے کلام کی منفرد خصوصیت ہے۔

غلام نبی گوہر (پیدائش ۱۹۳۴ء) جموں و کشمیر میں ڈسٹرکٹ اور سیشن جج رہے ہیں۔ وہ ناول نگار بھی ہیں اور نقّاد بھی۔ ۱۹۷۰ء اور ۱۹۷۵ء میں انھیں ریاستی اکادمی ایوارڈ سے نوازا گیا اور ۱۹۸۷ء میں جموں و کشمیر بسٹ بک ایوارڈ بھی دیا گیا۔

۱۵
پندرہ روپے

ISBN-81-260-0117-8